آخری تاجدارِ اودھ

یعنی

جانعالم واجد علیشاہ فرمانروائے اودھ کی تاریخ

اور اُن کی معزولی کے اسباب

مرتبہ

محمد تقی احمد ایم اے

کتاب خانہ

[illegible]

ناشرین

کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

قیمت ۸؍

سنہ ۱۹۴۵ء

باہتمام محمد اسمعیل صدیقی
ادبی پریس لکھنؤ میں چھپے

فہرست

پیش لفظ

مغلوں کی سلطنت کے کھنڈروں پر جو چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنیں، اُن میں اودھ کی بادشاہی بعض حیثیتوں سے خاص امتیاز کی مالک ہے لیکن اسی کے ساتھ ایک بڑی بدنصیبی بھی اُس کے شریک حال رہی۔ لکھنؤ اور اس کی تہذیب و تمدن اور شاہان اودھ کے حالات پر ایک ایسا افسانوی پردہ ڈال دیا گیا ہے جس سے حقیقت اور واقعیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ خصوصاً آخری تاجدار اودھ جان عالم سلطان واجد علی شاہ مرحوم کی ذات تو سب سے زیادہ بے سروپا روایتوں اور تاریخی ستم ظریفیوں کا شکار رہی ہے۔ ہم جناب تقی احمد صاحب ایم۔اے کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے آخری تاجدار اودھ کے حالات اور اُن کی معزولی کے اسباب کو صحیح اصول تاریخ کی روشنی میں پہلی بار اُردو میں پیش کر کے نہ صرف علمی و تاریخی بلکہ ایک قومی فرض بھی پوری دیانتداری کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔

ناشر

شاہانِ اودھ کی تخت نشینی اور زمانۂ حکومت

سعادت خاں برہان الملک .... سنہ ۱۷۱۱ء

ابو المنصور صفدر جنگ .... سنہ ۱۷۳۹ء

شجاع الدولہ .... سنہ ۱۷۵۶ء

آصف الدولہ .... سنہ ۱۷۷۵ء

وزیر علی خاں }
سعادت علیخاں } .... سنہ ۱۷۹۸ء

غازی الدین حیدر بادشاہ .... سنہ ۱۸۱۴ء

نصیر الدین حیدر بادشاہ .... سنہ ۱۸۲۷ء

محمد علی شاہ .... سنہ ۱۸۳۷ء

امجد علی شاہ .... سنہ ۱۸۴۲ء

واجد علی شاہ .... سنہ ۱۸۴۷ء

ضبطی سلطنت .... سنہ ۱۸۵۶ء

(شجرۂ شاہانِ اودھ)

سعادت خاں برہان الملک بانیٔ سلطنت اودھ (۱۷۲۲ء تا ۱۷۳۹ء)

نواب بیگم دختر برہان الملک ۔ ابو المنصور صفدر جنگ داماد برہان الملک (۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۶ء)

نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۷۵ء)

نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء)

نواب وزیر علیخاں (۱۷۹۸ء)

نواب سعادت خاں (۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء)

غازی الدین حیدر بادشاہ (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء)

نصیر الدین حیدر بادشاہ (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء)

محمد علی شاہ (۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء)

امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء)

واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء)

باب اوّل

تاریخ اودھ پر سرسری نظر

بڑھ گئی کُھدنے سے زیادہ اورشان لکھنؤ
لامکاں ہے اندنوں ہر اک مکانِ لکھنؤ

انسان کو فطرتاً وہی باتیں خوب یاد رہتی ہیں جن کا اثر اُس پر زیادہ ہوتا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ اودھ کی تاریخ کا سب سے زیادہ مؤثر حصہ یعنی واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کی معزولی کا واقعہ اس وقت تک ہمارے دماغ میں محفوظ ہے۔ اس آخری تاجدار کے سوانح حیات سے ہر شخص کو ذوق ہے اور ہزارہا واقعات جن سے اُس کی فیاضی، انسانیت، اور مذاق سلیم کا پتہ چلتا ہے زباں زدِ خلائق ہیں، مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو تاریخ اودھ کی دلچسپ داستان تاریخی تسلسل کے ساتھ

سن چکے ہوں اس لیے قبل اس کے کہ اصل موضوع پر بحث کی جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت اودھ کی تاریخ کا ایک نہایت مجمل خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

بقول شخصے "لکھنؤ میں مسلمانوں کی بادشاہت! ایک خیال تھا کہ کہ دماغ میں آیا اور نکل گیا، ایک خواب تھا، پوری طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ آنکھ کھل گئی .... ایک طلسم تھا کہ دم کے دم میں بنا...... اور پھر چشم زدن میں ایسا مٹا کہ کہیں نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔" تاہم یہ طلسمی منظر کچھ ایسا دلفریب تھا کہ آج تک لوگوں کو یاد ہے زمانہ کے انقلابات اور آسمان کی گردش اس کو بھلا نہ سکی، اس کا بیان اس وقت بھی لطف اندوز اور پر کیف ہے۔

مستم از بادۂ شبانہ ہنوز

اٹھارہویں صدی میں سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوتے ہی سلطنت اودھ کی بنیاد پڑی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی کی اعلیٰ درجہ کی تہذیب اور وہاں کے تمدن کو سلطنت کی تباہی سے ایسا سخت صدمہ نہیں اٹھانا پڑا جیسا کہ قدرتاً امید کی جا سکتی تھی اس لیے کہ یہ نئی سلطنت اس بار عظیم کو اٹھانے کے لیے تیار ہو گئی اور "مشرقی تمدن اور دور وسطی کی تہذیب کا آخری نمونہ" بن کر صفحۂ تاریخ پر روشن ہوئی۔

سعادت خاں نے اٹھارویں صدی کی ابتدا (۱۷۲۱ء) میں اس سلطنت کی داغ بیل ڈالی، اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد

دہلی میں قدر شناسی مفقود ہو گئی تھی اور سعادت خاں یا نظام الملک کے ایسے ذی استعداد امراء کی دہلی میں گنجایش نہ تھی لہذا سعادت خاں اودھ کے صوبہ دار بنا کر روانہ کر دیے گئے۔ یہ سادات نیشاپور سے تھے اور تلاش معاش اور بالخصوص اپنے والد کی قدمبوسی کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ چند روز ادھر ادھر رہ کر آخر کار شاہجہاں آباد یعنی دہلی پہونچے یہاں باوجود اس کے کہ شاہنشاہی کارخانہ درہم برہم ہو چکا تھا پھر بھی ایسے ذی جوہر سپاہی منش شرفاء کے لیے معیشت اور ترقی کے دروازے بالکل بند نہ تھے یہ زمانہ فرخ سیر کی بادشاہت کا تھا بعض امرائے دربار کی قدر شناسی اور اعانت سے برسر روزگار ہو گئے چند دنوں بعد دربار میں بھی رسائی ہو گئی رفتہ رفتہ اکبرآباد یعنی آگرے کے صوبہ دار مقرر ہوئے سادات بارہہ کی بیخ کنی کے سلسلہ میں برہان الملک کا لقب ملا اور محمد شاہ کے خاص معتمد ہو گئے۔

اس وقت صوبۂ اودھ شورشوں کی آماج گاہ تھا۔ دہلی میں ایک زبردست جماعت برہان الملک کے خلاف تھی۔ ساتھ ہی ساتھ برہان الملک مسلمہ طور پر سب سے قابل جنرل اور بہترین مدبر خیال کیے جاتے تھے۔

مصنف عماد السعادت کا یہ لکھنا کہ

ایزد متعال اورا از ازل مستعد بہ ایالت و امارت ساختہ و جبلتش را بجبلہ حکومت و امارت پرداختہ	خداوند عالم نے اُسے ازل ہی سے قوت و امارت کا اہل بنایا اور اسکی فطرت کو حکومت و سلطنت سے آراستہ کیا تھا۔

تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر سریواستو مصنف "فرسٹ ٹو نوابس آف اودھ" نے بھی

برہان الملک کی فوجی قابلیت اور مدبرانہ اہلیت کو تسلیم کیا ہے بس یہی وجہ ان کی دہلی سے اودھ کی طرف مراجعت کی ہوئی۔ ان کے مخالف ان سے خائف تھے، لہذا برہان الملک کو اودھ کا صوبہ دار بنا کر روانہ کر دیا گیا۔

سچ ہے۔ ع

عدو شود سبب خیر اگر خدا خواہد

قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ان کے ہاتھوں ایک جدید سلطنت کی بنیاد پڑنا تھی اور اس طرح مشرقی تہذیب و تمدن ابھی کچھ دنوں اور قائم رہنا تھا جس کی بدولت اودھ کے ہندو اور مسلمان شرفاء کے خاندان سلطنت مغلیہ کے مٹ جانے کے سوا سو برس بعد تک افلاس اور ادبار کے حملوں سے محفوظ رہے اور مشرقی علوم و فنون اور ہندوستان کے اہل کمال کو غیر معمولی سرپرستی حاصل ہوئی۔

برہان الملک کے اولاد نرینہ نہ تھی۔ اُن کے مرنے کے بعد اودھ کی صوبہ داری اُن کے داماد اور بھانجے ابو المنصور صفدر جنگ کو (۱۷۳۹ء) ملی۔ ان کی پیدائش اور بچپن کے حالات اسی قدر معلوم ہیں جس قدر کہ خود سعادت خاں کے، جس کی وجہ ظاہر ہے ابتدائی حصہ زندگی نہایت پریشانی میں گزرا ماموں (سعادت خاں) نکر معیشت سے تنگ ہو کر ہندوستان

آتے۔ افلاس کا یہ عالم تھا کہ بہ الفاظ مصنف دیباچۂ شباب لکھنؤ۔
خالہ کے دودھ نے جان بچائی دائی تک میسر نہ تھی، مگر برہان الملک کے اقبال و دولت کی جوانی بھانجے کے شباب سے معاصر ہوئی برہان الملک نے بہن اور بھانجے کو ہندوستان بلا بھیجا اور اپنی بیٹی صدر جہاں بیگم سے شادی کر کے عروس سلطنت سے وابستہ کر دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خانہ داماد سلطنت بنا دیا۔"

اودھ کی نائب صوبہ داری کے عہدہ پر مامور ہو کر صفدر جنگ نے برہان الملک ہی کے زمانہ میں امور ملکی سے واقفیت حاصل کر لی تھی، ان کی علمی استعداد غالبًا ماموں سے زیادہ تھی البتہ فنون سپہ گری اور سیاست میں یہ برہان الملک کے سامنے طفل مکتب تھے، مگر خدا کی قدرت زمانہ نے موافقت کی انھوں نے ماموں سے زیادہ ترقی کی اور وزارت کے عہدہ پر سرفراز ہوئے یہی وجہ ہے کہ صوبہ داران اودھ نواب وزیر کے لقب سے موسوم ہوئے۔

صفدر جنگ کا زمانہ جس قدر پرآشوب تھا اتنا ہی ترقی کرنے کے مواقع سے پُر تھا۔ دہلی انقلابات کا گہوارہ بنی ہوئی تھی میر تقی میر جو ان واقعات کے چشم دید شاہد تھے ان سیاسی انقلابات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہر روز اختیار جہاں پیش دیگر یست[1]
دولت مگر گداست کہ ہر روز بر دریست

[1] صاحب اختیار ہر روز ایک نیا شخص ہوتا تھا اور حکومت در بدر ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی۔

ایسے پر آشوب زمانہ میں صفدر جنگ کو اپنی طاقت بڑھانے کے نہایت عمدہ مواقع ملے۔ دہلی اور اودھ دونوں ان کی ترقی کے زینہ بنے اگر دہلی میں ان کے حریف اور مقابلہ کرنے والے موجود تھے تو اودھ کا میدان بالکل صاف تھا اور یہاں خود مختار سلطنت قائم کرنے کا بہترین موقع تھا آخر صفدر جنگ نے اپنے ہی زمانہ میں اتنی طاقت حاصل کرلی کہ اودھ اور دہلی میں صرف نام کا تعلق باقی رہ گیا

صفدر جنگ کی وفات کے بعد ان کے نامور صاحبزادے شجاع الدولہ ۱۷۵۴ء میں سریر آرائے ریاست اور صوبہ دار اودھ ہوئے یہ ۱۱۴۴ھ مطابق ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوئے تھے جیسا کہ اُن کی تاریخ ولادت سے

زدولتخانۂ نواب منصور ۔۔۔ برآمد آفتاب از مطلع نور
۱۱۴۴ھ

سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ اودھ کے نوابوں میں سب سے زیادہ عالی ہمت مشہور اور قابل گزرے ہیں ان کے مخالفین بھی ان کی فوجی اور سیاسی قابلیت اور عالی ہمتی کے مداح تھے مصنف سیر المتاخرین جن کو ان سے اس بنا پر اختلاف تھا کہ انھوں نے حافظ رحمت خاں سے بدسلوکی کی تھی، لکھتے ہیں۔

سرکار عمدہ دولت و صفات حمیدہ هم در ذات او مجتمع و خلق کثیر ... از او منتفع بود	... کی حکومت عمدہ تھی اور اُس کی ذات خوبیوں کا مجموعہ تھی کثیر خلقت نے اُس کی دولت و سلطنت سے نفع حاصل کیا۔

اُن کے نقصانات او معایب ابتدائی ... تصنیف ... السعادت ... میں

تفصیل سے درج ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حکومت کی قابلیت کس قدر اعلیٰ درجہ کی تھی۔ انصاف اور فیاضی ان کے ہر دلعزیز ہونے کی باعث ہوئی۔ مصنف تاریخ "فرح بخش" جو ان کے ہمعصر تھے انکی بیدار مغزی اور جانفشانی کے مداح ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ "اگر شجاع الدولہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو فیض آباد دوسرا دہلی بنجاتا صبح شام دونوں وقت شہر میں سوار ہو کر خود گشت کرتے تھے اور سڑکوں اور گلیوں کی درستی اور دوکانداروں کی حالت اور مظلوموں کی دادگری یہاں تک کہ رعایا سے متعلق تمام باتوں کو خود دیکھتے اور طے کرتے تھے۔ تجارت کی ترقی اس درجہ تھی کہ افلاس کا پتہ بھی نہ تھا۔ اسی لیے ماہرین فن مثلاً اطبا، شعرا، نجار، معمار، خطاط وغیرہ دوسرے شہروں کو چھوڑ کر فیض آباد جاکر رہے۔ شہر کے بازاروں میں اس قدر مجمع رہتا تھا کہ اس سرے سے اُس سرے تک جانے میں کافی وقت صرف ہوتا تھا اور شانہ سے شانہ چھلتا تھا۔ فوج اس قدر کثیر تھی کہ شہر کے باہر ایک بہت بڑی چھاؤنی قائم کرنا پڑی ایک لاکھ بیس ہزار تو صرف پیادہ سپاہی تھے۔ بائیس ہزار جاسوس اور مخبر تھے جو ساتویں دن دکھن اور پندرھویں دن کابل کی خبریں پہنچاتے تھے مرہٹوں۔ نظام اور ضابطہ خاں وغیرہ کے سفیر بھی نواب کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔"

دفعتاً نواب نے ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا مصنف "تاریخ اودھ" نے ان کی موت کے واقعہ کو جو رنگ دیا ہے وہ قطعی مورخانہ نہیں مصنف

"سیر المتاخرین نے بہت صاف لکھدیا ہے کہ یہ رکیک واقعہ محض بے بنیاد ہے۔

چنیں اشتہار یافت کہ شجاع الدولہ بادختر حافظ رحمت داعیہ خلوت نمودہ او را پیش خود خواند او از فرط غیرت و شدت جہالت کہ در طبائع نسواں خاصہ زنہا ے افغان میباشد چاقوئے مخفی باخود بردہ ہنگام کشمکش عورت در انجا زدہ مجروح ساخت و آں چاقو را بہ زہر آب دادہ بود لہذا ارو بہ بہی نمی آورد با آنکہ ایں سخن مطلقاً اصلے نداشت و محض غلط بود اما بمرتبہ شہرت یافت کہ الی الآن بعض کساں ہمیں می دانند و علت مردنش می شناسند۔

ایسا مشہور رہے کہ شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خاں کی صاحبزادی سے ہم بستر ہونے کا ارادہ کیا انھوں نے عصمت دری سے محفوظ رہنے کے لیے ایک زہر سے بجھا ہوا چاقو اپنے جوڑے میں چھپا رکھا تھا اور نواب کو موقع پاکر زخمی کیا کہ زخم مندمل نہ ہوسکا۔ مگر یہ واقعہ غلط ہے باوجودیکہ اس کو عام شہرت حاصل ہے چند لوگ اب بھی اس کو سچ سمجھتے ہیں اور شجاع الدولہ کی موت کا سبب یہی بیان کرتے ہیں۔

مصنف "سیر المتاخرین" خود بھی شجاع الدولہ کے بہت زیادہ مداح نہیں نہ اُن کو کوئی وجہ اس تردید کی تھی مصنف "فرح بخش" اور "عماد السعادت" بھی موت کی وجہ ران میں گلٹی کا نکلنا اور زہریلے مادہ کا پھیل جانا بتاتے ہیں معلوم نہیں مؤرخ صاحب نے ہمعصر مورخین کی راے کو کیوں نہیں قابل قبول تصور کیا حالانکہ موافقین و مخالفین دونوں افواہ کی تردید

کرتے تھے۔ ذاتی کمزوریاں شجاع الدولہ میں ضرور تھیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ تاجداران اودھ میں چند ہی ان کمزوریوں سے پاک تھے پہلے دو صوبہ دار سعادت خاں برہان الملک اور ابو المنصور صفدر جنگ یا اخیر دور میں امجد علی شاہ۔ مگر ان کمزوریوں سے شجاع الدولہ کی قابلیت اور ہر دلعزیزی کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ میجر پولیر جو اس وقت فیض آباد میں موجود تھے لکھتے ہیں۔

"It is difficult to find words to express the sorrow and grief of almost all his attendants and in general of every inhabitant of this place at his death which makes in my opinion no bad apology of a prince who with many faults must yet be acknowledged to have been not only but also endowed with many good and worthy qualities."[1]

---

[1] جو صدمہ نواب کے متوسلین اور اس مقام کے عام باشندگان کو اُن کی موت سے ہوا وہ ناقابل بیان ہے اور میری رائے میں یہ اس کا ثبوت ہے کہ باوجود کمزوریوں کے نواب بہت سے صفات محمودہ رکھتے تھے جو ایک والی ملک کے شایانِ شان ہیں۔

شجاع الدولہ کے بعد اُن کے بیٹے آصف الدولہ ۱۷۷۵ء میں سریرآرائے ریاست ہوئے۔ آصف الدولہ کی تخت نشینی اودھ کی تاریخ میں ایک جدید دور کی ابتدا ہے۔ لکھنؤ کی ترقی اور فیض آباد سے رفتہ رفتہ تمام عملہ اور منتسبان دربار کی معاودت اس جدید دور کی ظاہری صورت اور اس کا صرف ایک رُخ ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فنون لطیفہ کی ترقی اور اودھ کی تہذیب و تمدن کا زمانہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔

سعادت خاں، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ ملک گیری، سپاہیانہ زندگی اور میدان کارزار کے رسیا تھے۔ سعادت خاں نے نادر شاہ کے حملہ کے وقت، صفدر جنگ احمد شاہ ابدالی کی جنگوں میں، اور شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی میں حصہ لیکر اپنی فوجی قابلیت اور ملک گیری کے حوصلہ کا اظہار کیا۔ فتح ہوئی یا شکست بہرصورت اس سے اُن کے طبعی رجحان کا صاف پتہ چلتا ہے۔ ملک گیری اور میدان کارزار اس دور کے تاجداران اودھ کا اصل مشغلہ تھا۔ فیض آباد کی عمارتیں صفدر جنگ کی سادگی مزاج اور مصروفیت کا پتہ دیتی ہیں، سپاہی کو سوائے لڑائی کے سامان درست کرنے کے اور کیا مشغلہ ہو سکتا ہے، اُس کو عالیشان عمارتوں پر روپیہ صرف کرنے اور اُن کے حُسن و قبح کو غائر نظروں سے مطالعہ کرنیکا کہاں وقت، اس کے لیے تو محض وقتی ضرورتوں اور موسمی شدائد سے بچنے کے واسطے پھوس کے چھپر اور اسی طرح کے کم خرچ اور ضرورت پورا کرنے والی عمارتوں کی حاجت ہوتی ہے اور اس کا اصول تو صرف یہ ہے

ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

چنانچہ لکھنؤ کی سی عالی شان اور نازک عمارتیں فیض آباد میں کبھی نہ تھیں صفدر جنگ اور سعادت خاں نے تو محض پھوس اور مٹی کی وقتی چھائونیاں تیار کرائی تھیں شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی سے مراجعت کے بعد شہر کی درستی پر روزانہ کچھ وقت صرف کرنا شروع کیا تھا فیض آباد کی سب سے بڑی عمارت بہو بیگم صاحبہ کا مقبرہ ہے جو سعادت علی خاں کے زمانہ میں تعمیر ہوا شجاع الدولہ کے زمانہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

مختصر یہ کہ آصف الدولہ کی تخت نشینی سے اودھ کے تاجداروں کے مشاغل میں انقلاب عظیم پیدا ہوتا ہے اس زمانہ تک ان کے مشاغل ملک گیری فوجی استحکام اور بیرونی حکمت عملی تھے دور جدید میں ان چیزوں کی کوئی گنجائش نہ تھی، ملک گیری اور بیرونی حکمت عملی الہ آباد کے صلح نامہ (۱۷۶۵ء) کے بعد ختم ہوگئی اس لئے کہ عہد معاونت جس کا سب سے پہلا نشانہ اودھ ہوا اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ دوسری ریاستوں کے ساتھ بغیر کمپنی کے مشورہ کے کوئی معاملت کی جائے اور ملک گیری تو قطعی ممکن ہی نہ تھی، فوج کا بڑھانا اول تو شرائط صلح کے خلاف تھا۔ دوسرے بغیر ضرورت فوج کا رکھنا نہ تو مالی حیثیت سے اور نہ بلحاظ احتیاط مفید تھا۔ ایسی صورت میں ان مشاغل سے قدرتاً بے توجہی ہوتی گئی۔ علاوہ اسکے انگریزوں کا ستارۂ اقبال کچھ اس طرح چمک رہا تھا کہ ہر چہ برا فتد در افتد، کی سیکڑوں مثالیں موجود تھیں، حیدر علی۔ ٹیپو۔ نظام اور مرہٹے اودھ سے بہت زیادہ بڑی طاقت کے مالک تھے اور ملک گیری اور سیاست میں

تاجداران اودھ سے بہت بہتر درجہ رکھتے تھے مگر انگریزی حکمت عملی، سیاست اور فوجی انضباط نے سب کو پیس ڈالا۔

بہرصورت شجاع الدولہ کی نصیحت پر کاربند ہونا ہی بہتر تھا

"ازصاحبان انگریز درہیچ وقت خلاف نخواہند کرد"

(چشمۂ فیض مصنفہ منشی فیض بخش)

لہذا آصف الدّولہ کے زمانہ سے تاجداران اودھ کا سب سے بڑا مشغلہ بیت السلطنت (لکھنؤ) کی ترقی، عمارات کی تعمیر اور فنون لطیفہ کا مذاق سلیم رہا، مگر اس میں شک نہیں کہ افراط و تفریط سے اکثر آخری تاجداران اودھ کا دامن آلودہ رہا، خصوصًا نصیر الدین حیدر نے تو مذہب کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا تھا اور بہت سی لغو بدعات ان کے زمانہ کی یادگار ہیں۔

دہر گاہ روز ولادت کدام امام فرخندہ فرجام رسیدے مثل زناں باردار خود را بدرد زہ و طلق و مخاض از راہ تصنع مبتلا ساختے و بجائے طفل یک لعبت مرصع پیشش می گذاشتند و خود در زچہ خانہ می نشستند و پرستاران مخصوصہ ایں خدمت طعامی کہ برائے زچہ معین است بکمال احتیاط پختہ می خورانیدند	ائمہ کی ولادت کے دن حاملہ عورتوں کی طرح سے تمام حرکات مثلاً دردزہ کی تکلیف کی شکایت کرتے تھے۔ زچہ خانہ میں بیٹھتے تھے اور مخصوص خادمائیں بڑی احتیاط سے زچوں کے کھلانے والے کھانے تیار کرکے پیش کرتی تھیں اور ان ایام میں کوئی شخص بادشاہ کو چھو

دوراں ایام کسے آنحضرت را مس
نمی ساخت و ہرگاہ ششم روز
می شد آنحضرت غسل می فرمودند
و پرستارے آں طفل جواہر نگار را
بیک گوشہ بردہ بدست گرفتہ
می ایستاد و پرستار دیگر چند سبوچہ
آب را در انجا فرد می ریخت ایں را
بجاے غسل طفل قرار دادہ بودند
وقت شب بہ آرایش و پیرایش
زنانہ آں طفل را در آغوش گرفتہ
...... نقل زنان نوزادہ برائے
ستارہ بینی کہ رسم اہل ہند است
در صحن مکان باکمال شوکت و شان
بر می آمدند ...... و ہم چنیں برائے
ہر یکے از ازواج مقرری لمہدی
عشر طفلے از لعبت زریں و برائے
ازواج دیگر پیشوایان دین مبین
طفلے از لعبت سیمیں بحفظ مراتب
بود ہرگاہ ایام ولادت دیگر امام زادگاں

نہیں سکتا تھا۔ چھٹے دن غسل
ہوتا تھا اور اس "لعبت مرصع"
کو جو مصنوعی بچہ کی جگہ پر مانا
جاتا تھا کونے میں لے جاکر ایک
خادمہ کھڑا کر دیتی تھی اور
دوسری بطور غسل کے چند
گھڑے پانی چھڑک دیتی تھی
اسی روز رات کو زنانہ لباس
پہن کر اور اس بچہ کو زچہ
کی طرح سے گود میں لے کر
بادشاہ بڑی شان و شوکت
سے صحن مکان میں تشریف
لاتے تھے اور اہل ہند کی
رسم تارہ بینی اس طرح پر
منائی جاتی تھی ....
ائمہ کے لئے لعبت زرین اور
دوسرے پیشوایان دین
کے لئے لعبت سیمیں رکھے
جاتے تھے اور باقی امام زادوں

سوائے ائمۂ اثنا عشر رسیدے ازواج مسطورہ بطرفہ معمولی حضرت سلطنت مرتبت آثار ازائیدے و بروز فراغ از اچھوتہ لباس زنانہ زیب قامت سلطانی ساختہ مثل زنان در محفہ جواہر نگار نشست۔

(وقائع دلپذیر مصنفہ عبدالاحد ابطا)

کی پیدائش کا وقت جب آتا تھا تو ازواج مذکورہ ان کو بادشاہ سلامت کے طریقہ سے جنتی تھیں اور زچگی سے فراغت کے روز بادشاہ زنانہ لباس پہن کر مرصع اور مکلف ڈولی میں سوار ہوتے تھے۔

نصیر الدین حیدر کے اس طرح کے اور بھی غیر شرعی حرکات تھے مثلاً ایک دن انھوں نے امام حسین علیہ السلام کا ایک مصنوعی جنازہ تیار کیا اور حضرت سلطان العلما کو نماز جنازہ کے لئے طلب فرمایا انھوں نے قطعی انکار کیا اور یہ کہا کہ میری کیا ہمت، امام کی نماز جنازہ امام ہی پڑھا سکتا ہے

(ملاحظہ ہو مبلغ غفران مآب منبر رجب و شوال ۱۳۷۴ھ)

دوسری مثال واجد علی شاہ کی ہے جنھوں نے رہس قائم کیا تھا اس کا چشم دید حال جو ایک ہمعصر کے قلم کا لکھا ہوا ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"۱۲۶۸ھ میں مزاج حضرت کا مصروف تماشائے رہس ایجادی ہوا اور دل لگی سہو نہو ہونے کا سامان بندہا خود بدولت نے زبان لطافت ترجمان سے بمصداق کلام الملوک ملوک الکلام ایک مثنوی چونچلوں بھری کہی .... اس کی حقیقت دیو پری کا فقیر جوگی

وزیر و بادشاہ ...... باغ و پہاڑ، نچا خانے اور چھٹی وغیرہ کا سامان ہو بہو ویسا ہی ہوا لاکھوں کی تیاری ہوئی پریوں کی پوشاک زرین کارچوبی بہت کچھ لگ کر بنی عملہ اس کا جزو و کل نوکر رکھا گیا اس کے دو رہس قرار پائے دو نے مزے اڑائے بڑا رہس حیدری رنڈی چکلہ والی کو دیا اور چھوٹا رہس مستقیم الدولہ ...... کو ملا ...... القصہ سارا اس کہانی کا بیان ذرہ ذرہ مع سامان حضرت نے بنوایا ہو بہو نقل کو اصل کر دکھایا جنگل پہاڑ شکارگاہ طلسمی اور جن دیو پری جادو کا حوض اور طوطی کا جوڑا قصر و بیابان سارا پرستان بنوایا سب موجود کیا سارا نقشہ اس کا اتارا پہلے آپ حضرت بدر الدجا بنتے لڑکا ہوتے اور فقیر کی دعا لیتے، پھر بعد چھٹی چہلوں کے ماہ پیکر کی صورت ساری کہانی کے مصداق ہو جاتے“

(مرقع خسروی مصنفہ عظمت علی)

مگر یہ واقعات کتنے ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں ان کا تعلق ذاتیات سے ہے نہ کہ سیاست اور حکومت سے نصیر الدین حیدر کی بدعات سے خفگی علما اور فقہا کو ہونا چاہیئے نہ کہ مؤرخ کو۔ اور اسیطرح واجد علیشاہ کے رہس سے ناراضگی تو صرف زاہد کو ہو سکتی ہے اس لئے کہ

”تمام اہل شہر اور چھ چھ کوس کے آدمی اسے دیکھنے آئے ......

...... حضرت لاس منزل کے کوٹھے پہ بے محابا خلق اللہ کو دیکھنے اور دکھانے کو رونق افروز ہوئے ...... ایک ہجوم عام تھا۔ عجیب لطف کا اثر دہام تھا ہر کوئی نقش ...... بنا ہوا تھا حضرت کا

جمال باکمال دیکھ کر سہو ہوا اور ٹھہر گیا۔ دل بے اختیار یہ چاہتا ہے کہ ان کو دیکھا کرے"
(مرقعہ خسروی مصنفہ عظمت علی)

جو لوگ تصویر کے دوسرے رخ کو نہیں دیکھتے وہ ان چیزوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس سے زیادہ قابل تعریف کیا بات ہو سکتی ہے کہ ان کا وقت مردم آزاری میں نہیں صرف ہوا۔ اسوقت سوال اس کا نہ تھا کہ شاہ اودھ کوئی مفید سیاسی خدمت ملک اور رعیت کی کر سکیں اس لئے کہ ان کے ہاتھ پاؤں بالکل بندھے تھے بلکہ صرف اس کا لحاظ رکھنا تھا کہ رزیڈنٹ اور بادشاہ کے تعلقات کی خرابی سے رعایا کو نقصان نہ پہونچے مثلاً ان ملازمین ریاست کو جو رزیڈنٹ کی خیر خواہی میں بادشاہ کے خلاف مخبری یا دوسری کارروائی کرتے تھے نقصان نہ پہونچایا جائے یا ایسے مواقع کو دور رکھا جائے جن سے علی الاعلان تہتک کی صورت پیدا ہو۔ زیادہ وضاحت کے خیال سے دو واقعات ناظرین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ حضور عالم علی نقی خاں وزیر کی سواری ایک روز بازار سے نکل رہی تھی ایک تلنگہ جو رزیڈنٹی کا ملازم تھا چھتری لگائے جاتا تھا۔ آداب سواری کے لحاظ سے اُسے چھتری اتار دینا چاہئے تھی مگر اس نے واقعات حاضرہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے چنداں خیال نہ کیا۔

دوسرا واقعہ بھی رزیڈنٹی سے متعلق ہے۔ پہرہ کے سپاہی سے ایک رات کو غفلت کی وجہ سے بندوق چھوٹ گئی شاید وہ سو گیا اور بندوق چل گئی۔ اس نے بہانہ کیا کہ میں نے ایک آدمی کو رزیڈنٹی کی

چھت پر دیکھا اور جب وہ نہ ہٹا تو میں نے فائر کیا ریزیڈنٹ صاحب نے
طے کر لیا کہ ان کے خلاف دربار کی سازش سے قتل کی کوشش کی گئی تھی۔
جب حالات یہ ہوں تو بتلائیے کہ رس کھیلنا اچھا یا روز کے
فسادات جو بہر صورت کوئی عمدہ نتیجہ نہ پیدا کرتے اور ہوتا وہی جو طے
ہو چکا تھا یعنی ضبطی ریاست۔

اصل موضوع سے کسی قدر فصل ہو گیا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ باوجود بدعات
کے فروغ اور رس بازی کے رعایا قطعی خوشحال تھی آصف الدولہ سے لیکر
واجد علی شاہ تک فنون لطیفہ کی ترقی، عمارات اور بیت السلطنت کی
معموری اور ساتھ ہی ساتھ خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اور یہی تاریخ اودھ کا دور
جدید تھا جس کو قدیم یعنی پہلے تین تاجداروں کے زمانہ کی ملکی اور سیاسی
کارناموں سے علیحدہ تصور کرنا چاہئے آصف الدولہ کی حیثیت تاجداران اودھ
میں ویسی ہی ہے جیسی کہ شاہجہاں کی سلاطین مغلیہ میں۔ آصف الدولہ کی
بدولت لکھنؤ بھی دہلی و آگرہ کے ساتھ آثار قدیمہ اور فن عمارت کے شوقین
سیاحوں کی گذرگاہ ہوا۔ آصف الدولہ میں بہت سی خوبیاں تھیں جن کی
قدر اُن کے ہمعصر نہیں کر سکے مصنف تفضیح الغافلین اور فرح بخش، با چشمہ
فیض جنھوں نے شجاع الدولہ کا وقت دیکھا تھا اور اُن کے فوجی انضباط
ملکی اور سیاسی قابلیت کے معترف تھے آصف الدولہ کو محض بیکار سمجھتے تھے
یہی رائے اُن کی ماں اور دادی (بہو بیگم اور نواب بیگم) کی بھی تھی تعجب
معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ کی عمارتیں جو اس وقت شاہان اودھ کی

یادگاروں میں اس قدر قابل ناز ہیں اس زمانہ کے لوگوں کی نگاہوں میں کس قدر قابل الزام تھیں۔ مگر زمانہ نے بتادیا کہ ہمعصر مؤرخین کی راے صواب پر نہ تھی۔ آصف الدولہ میں فوجی قابلیت نہ تھی۔ اُنھوں نے شجاع الدولہ کی تیار کردہ فوج کو کم کردیا جس کی وجہ انگریزوں کی پالیسی تھی نہ کہ آصف الدولہ کی فوجی ناقابلیت۔ مگر انھوں نے رعایا پروری فیاضی اور خوش معاملگی کا عمدہ ثبوت دیا۔ حافظ رحمت خاں کی اولاد کے ساتھ اُن کا سلوک شجاع الدولہ کی بد معاملگی اور بدسلوکی کا بدل ہے فیاضی اور رعایا پروری اس درجہ اُن کے خمیر میں تھی کہ اس وقت تک لوگ آصف الدولہ کا نام عزت اور محبت سے لیتے ہیں اور یہ مثل مشہور ہے "جس کو دلوائے مولا اس کو دے آصف الدولہ" یا "جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ"۔ لکھنؤ آصف الدولہ کے زمانہ سے پہلے محض چند گاؤں کا ایک مجموعہ تھا جس میں شہری حیثیت بالکل نہ تھی آصف الدولہ کی سیرچشمی اور فیاضی نے فیض آباد۔ دہلی اور دوسرے مشرقی تہذیب کے سرچشموں سے آب زندگانی کی سیراب کرنے والی نہریں اس طرف نکالیں اور چشم زدن میں یہ مشرقی تہذیب اور تمدن کا بہترین مگر آخری نمونہ بن گیا۔ اودھ کے تمدن کی تاریخ اسوقت سے شروع ہوتی ہے۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کے پانیر اخبار میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں لوگ بڑی دور کی کوڑیاں لائے تھے۔ ڈاکٹر رادھا کمد مکرجی پروفیسر ہند و انڈیا لکھنؤ یونیورسٹی جن کو آثار قدیمہ کی تحقیق کا بہت بڑا ذوق ہے لکھنؤ کی تاریخ تمدن کی بنا

اس وقت سے تصور فرماتے ہیں جبکہ راجہ جنک نے دنیا کی سب سے پہلی فلسفیانہ کانفرنس اجودھیا میں کی تھی۔ "کانفرنس" "فلسفیانہ" اور "دنیا کی سب سے پہلی" ان جدید خیالات کا کم از کم تین ہزار برس قبل انسانی دماغ میں اسی نوعیت سے داخل ہونا جیسا کہ آپ نے صرف حیرت انگیز بلکہ عقیدت مندانہ دماغی کمزوری کا ثبوت ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ اشوک نے لیگ آف نیشنس قائم کی تھی اس لئے کہ اس نے دوسری ریاستوں سے کشت و خون کے خیال سے جنگ نہیں کی اور یہ کہ رامچندر جی کے زمانہ میں ہوائی جہاز تھے اور مہابھارت میں (Mexico) میکسیکو سے لڑنے کے لئے فوجیں آئی تھیں۔ ہم کو آصف الدولہ کی طرف سے قابل پروفیسر صاحب سے یہ عرض کرنا ہے کہ لکھنؤ کے تمدن کی بنیاد درحقیقت نہ راجہ جنک کی ہے اور نہ اکبر کی بلکہ جو کچھ آج لکھنؤ میں ہے اس کا بانی آصف الدولہ اور اسکو ترقی دینے والے شاہان اودھ تھے اور کوئی نہیں۔ بہرصورت عموری حیثیت سلطنت آصف الدولہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کا اثر اودھ کی تاریخ تمدن اور معاشرت پر بہت پڑا۔

آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۷ء میں ہوا۔

انہا روح و ریحان و جنات نعیم

تاریخ وفات (۱۲۱۲ھ) ہے۔

ان کے بعد وزیر علی خاں تخت نشین ہوئے اور چار مہینے کے بعد انگریزوں نے ان کو معزول کر کے آصف الدولہ کے بھائی سعادت علیخاں کو

تخت نشیں کیا جس سے انگریزوں کو بڑا فائدہ ہوا سنہ ۱۸۰۱ء میں آدھا اودھ کا ملک انگریزوں کے پاس چلا گیا۔ اس وقت لارڈ ولزلی کا زمانہ تھا جو دیسی ریاستوں کے لئے حضرت عزرائیل سے کم نہ تھے یہ عہد معاہدات کے اصول کے بانی ہوئے جس کی بدولت رفتہ رفتہ تمام دیسی ہندوستان انگریزی مقبوضات میں تبدیل ہو گیا۔ اتفاق وقت اودھ میں اس وقت سعادت علیخاں کا ایسا مدبر اور ہوشیار حکمراں تھا ورنہ غازی الدین حیدر یا نصیر الدین حیدر کا زمانہ ہوتا تو شاید ۱۸۵۶ء سے بہت قبل اودھ کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی تاریخ میں تین گورنر جنرلوں کے عہد بہت سخت گذرے ہیں۔ لارڈ ولزلی، لارڈ ہسٹنگز اور لارڈ ڈلہوزی۔ اگر لارڈ ولزلی کے زمانہ میں کوئی دیسی ریاست بچ گئی تو لارڈ ہسٹنگز نے اس کو چکھ لیا اور اگر پھر بھی بچ گئی تو لارڈ ڈلہوزی کی ضبطی کا حکم تو عام اور بیدھڑک تھا ہی اس سے کوئی نہ بچ سکا۔

غرض سعادت علی خاں کا زمانہ بہت ہی سخت تھا کرنل اسکاٹ اور بیلی ریزیڈنٹ تھے جن کو سعادت علی خاں ہی خوب سمجھتے تھے۔ ریزیڈنٹ اور نواب کی برابر کی چوٹیں چلتی تھیں۔ واجد علی شاہ اور کرنل سلیمن کا ایسا مقابلہ نہ تھا اور نہ تاجدار اودھ اس وقت تک ایسا کمزور ہو گیا تھا کہ کرنل بیلی خاطر میں نہ لاتے۔ سعادت علی خاں نے وہ وہ جھلاوے دیئے کہ ریزیڈنٹ کے دانت کھٹے ہو گئے۔ اودھ پیپرس (Oudh Papers) میں بہت تفصیل کیساتھ اس کاغذی جنگ کی کارروائیاں درج ہیں جن کو پڑھ کر سعادت علیخاں

کی بیدار مغزی اور اعلیٰ درجہ کی مالی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں تو سعادت علی خاں کے سیکڑوں قصے لوگوں کو یاد ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ انھوں نے مالی معاملات کو سمجھنے کے لئے غیر معمولی دماغ پایا تھا اور بہ نسبت نواب آصف الدولہ وہ بہت ہی چست تھے یہاں تک کہ وہ لوگ جنھوں نے آصف الدولہ کی سیر چشمی اور فیاضی دیکھی تھی وہ ان کو ممسک اور بخیل بھی کہتے تھے مگر واقعات یہ تھے کہ وہ محاصل سلطنت کا صحیح مصرف جانتے تھے۔ عاملوں کی رشوت ستانی اور ناجائز تحصیل وصول انھوں نے بند کرادی تھی۔ سی، ایم ایلیٹ نے اپنی بیش بہا تصنیف "اناڈکرانیکلز" میں جو رائے سعادت علی خاں کے متعلق قائم کی ہے وہ یہاں پر درج کرنے کے قابل ہے۔

Saadat ali[1] was an excellent man of business and all the time he could spare from trying to bring the Resident to reason, he spent in examining the

---

[1] سعادت علی خاں امور سلطنت نہایت عمدہ طریقہ سے انجام دیتے تھے اور ان کا جتنا وقت ریزیڈنٹ صاحب کے سمجھانے بجھانے سے بچتا تھا اس کو وہ حساب کی جانچ صوبہ داروں کے کام کی نگرانی اور احکام کے اجراء میں صرف کرتے تھے۔ ان کو اپنی یادداشت پر فخر تھا اور اسی لئے ان کو امور ملکی کی تمام تفصیلات ازبر تھیں۔

account from the Provinces issuing orders and instructions and carefully noting the work done by each of his Subedars. He made it his boast to forget nothing and thus he had all the details of the state of his country at his fingers end" (Oudh Chronicles)

"از سعادت تا بہ سعادت" مشہور ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ سلطنت اودھ کا بہترین دور سعادت خاں برہان الملک سے لے کر سعادت علی خاں تک تھا اس کے بعد انحطاط اور عیش پرستی کا زمانہ ہے۔

سعادت علی خاں کے بعد ۱۸۱۴ء میں غازی الدین حیدر تخت نشیں ہوئے۔ انھوں نے لارڈ ہسٹنگز کے اشارے سے "بادشاہ" کا لقب اختیار کیا۔ اس بادشاہت کا ڈھونگ صرف اس لئے رچایا تھا کہ دہلی کے بادشاہ کا ایک مدمقابل پیدا کر کے اس ظاہری حیثیت کو بھی میٹ دیا جائے جو اس وقت بھی وراثت کے طور پر مغل خاندان میں باقی تھی اور دنیا پر یہ ظاہر ہو جائے کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت یا شہنشاہیت در اصل کمپنی کے قبضہ میں ہے اور گورنر جنرل ادنیٰ اشارہ پر دہلی کے ایسے بادشاہ بنا سکتے ہیں۔ در اصل یہ نہایت گہری چال تھی جس کو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے

شاہ اودھ سمجھ نہ سکے۔ بادشاہت ملی تو ضرور مگر اس قدر بے کار کہ معمولی معاملات میں بھی گورنر جنرل کے حکم کی ضرورت تھی۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ مفتی خلیل الدین خاں مرحوم سفیر دربار اودھ کے چند خطوط ان کی کوٹھی واقع قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے تہ خانہ میں دستیاب ہوئے جن کو بحفاظت نقل کر کے محفوظ کرا لیا گیا ہے ان میں ایک خط اُس زمانہ کا بھی ہے جبکہ بادشاہت تفویض کی گئی تھی اور اس میں حسب ذیل عبارت مسئلہ زیر بحث پر روشنی ڈالتی ہے۔

"شاہ اودھ کہ بہر سہ بیگمات خود خطابہا دادہ اند در قبول آں اولیان این سرکار را بسیار عذر است چراکہ ایں خطابہائے بیگمات سلاطین دہلی است .... و در مقدمہ "شاہجہاں کہ شاہ اودھ را تبدیل آں گوارا نیست دریں امر نواب گورنر جنرل می فرمایند کہ جائے افسوس کہ شاہ اودھ را تبدیل ایں خطاب گوارا نیست و از ینجا بطرزے کہ اوشان میخواہند قبول نمی تواں شد۔

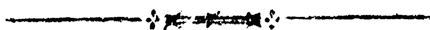
شاہ اودھ نے جو خطاب اپنی تینوں بیگموں کو دیئے ہیں انکی منظوری سرکار کمپنی سے نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ خطابات دہلی کی بیگمات کے ہیں اور شاہ اودھ کے مجوزہ خطاب شاہجہاں کے بابت جس کے تبدیل کرنے میں ان کو کلام ہے گورنر جنرل بہادر نہایت افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اس کی منظوری سرکار کمپنی سے ملنا ممکن نہیں ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ غازی الدین حیدر اپنی بیگمات کو نورجہاں اور ممتاز محل کا خطاب دینا چاہتے تھے اور خود شاہجہاں کا خطاب لینا چاہتے تھے۔ مگر حکم یہ ہوا کہ "از ینجا بطرزے کہ اوشان میخواہند قبول نمی تواں شد" نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے خطاب کو تبدیل کرکے بجائے شاہجہاں کے "شاہ زمن" اور محل خاص کے خطاب کو بجائے ممتاز محل کے بادشاہ بیگم بنانا پڑا۔ غرض یہ بادشاہت بازیچۂ اطفال سے بہتر نہ تھی اور اس کا مقصد شاہ اودھ کی حیثیت کو بڑھانا نہ تھا بلکہ کمپنی کی شاہنشاہیت کا مظاہرہ۔

نواب غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نواب نصیر الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں تخت پر بیٹھے اور چونکہ لاولد تھے لہذا ان کے بعد نواب سعادت علی خاں کے بیٹوں میں بحساب عمر سب سے بڑے یعنی نصیر الدولہ کو تخت کا مالک سمجھا گیا اور وہ محمد علی شاہ کے نام سے بادشاہ ہوئے۔ ان کی عمر بہت کافی تھی اور صحت بھی خراب تھی مگر یہ نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں امور مالی و ملکی کی تعلیم حاصل کرچکے تھے لہذا باوجود کبرسنی اور خرابی صحت انھوں نے پانچ سال کی کم مدت میں اصلاحات کیں اور پچھلے دو بادشاہوں سے بہت بہتر کام کیا۔

محمد علی شاہ کے بعد اُن کے بیٹے امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء) میں بادشاہ ہوئے جو آخری تاجدار اودھ یعنی واجد علی شاہ کے باپ تھے۔ انکو مذہبی معاملات میں اس قدر غلو تھا کہ ان پر تعصب اور غیر رواداری کا الزام رکھا جاتا ہے مگر تاجداران اودھ میں اُن کے سے پاک باز کم ہوئے۔

اُن کا انتقال ۱۸۴۷ء میں ہوا اور اُن کی جگہ پر آخری تاجدار اودھ یعنی واجد علی شاہ تخت نشیں ہوئے۔



بابِ دوئم

سوانح واجد علی شاہ

واجد علی شاہ ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء میں تولد ہوئے "قرۃ العین بدر عالی نژادہ" تاریخ پیدائش ہے۔ ان کے دادا نصیر الدولہ (محمد علی شاہ) جو ۱۸۳۷ء میں نصیر الدین حیدر کے بعد تخت نشیں ہوئے اس وقت خانہ نشیں اور غازی الدین حیدر سریر آرائے سلطنت تھے۔ بہر صورت اس کا گمان بھی نہ تھا کہ نوزائیدہ بچہ کسی وقت شاہ اودھ ہوگا۔ ان کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوئی۔ تاریخ اودھ میں ان کے اُستاد کا نام امداد حسین خاں درج ہے۔ محمد علی شاہ کی تخت نشینی کے وقت واجد علی شاہ کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ دادا کی تاجپوشی کے سلسلہ میں ان کا خطاب "ناظم الدولہ

محمد واجد علی خان بہادر ہوا پھر خورشید حشمت مرزا محمد واجد علی خان بہادر ہوا باپ کی تخت نشینی کے بعد ولیعہد ہوئے اور ابو المنصور سکندر جاہ سلیمان حشم صاحب عالم ولیعہد مرزا محمد واجد علی بہادر خطاب ملا یہ واقعہ ۱۸۴۲ء کا ہے جب واجد علی شاہ کا عنفوان شباب تھا اور عمر قریب تیس سال کے تھی۔

ولیعہدی اور اس سے قبل کا دور اُن کی خانگی زندگی کا دور تھا جس کے بہت زیادہ حالات دستیاب نہیں ہوتے مصنف تاریخ اودھ نے جو کچھ حالات قلمبند کئے ہیں وہ تمام ان کی عیش پرستی کے ہیں۔ ان کے کسی دوسرے مشغلہ کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ انھوں نے اُن کی پانچ برس کی عمر کا ایک عشقیہ واقعہ درج کیا ہے جس میں ایک چہل سالہ عورت سے ان کا بوس و کنار کرنا ان کی خود تحریر سے ثابت کیا ہے۔

بہرصورت اس صغر سنی کی حرکتیں قطعی معصومیت پر مبنی ہوتی ہیں اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہے اور واجد علی شاہ نے اس کو یاد رکھا اور درج کر دیا تو شاہ اودھ کی یاد اور واقعہ نگاری کی تعریف کرنا چاہئے۔ بابر اور جہانگیر کی خود نوشت سوانح عمریوں کی قدر زیادہ تر اسی وجہ سے ہے کہ دونوں نے اپنے محاسن و معایب کی اخفا کی قطعی کوشش نہیں کی اور اسی لئے یہ ذخیرے بیش قیمت اور مستند تصور کئے گئے چنانچہ شیر افگن کے قتل کے واقعہ کی تردید تزک جہانگیری سے صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ اگر جہانگیر نے شیر افگن کو قتل کرایا ہوتا تو جس طرح تمام واقعات کو صاف صاف درج کیا ہے اسی طرح وہ اسے بھی لکھ دیتا۔

غرض یہ ہے کہ یہ واقعات اوّل تو قابل بحث نہیں اس لیئے کہ زیادہ تر ذاتیات سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے کسی شخص کی زندگی کے محض یہی کارنامے بالتفصیل درج کرنا یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس کے دوسرے مشاغل کی طرف توجہ نہیں کی گئی ورنہ واجد علی شاہ کا ایسا "اختراع دوست" اور علوم مروجہ کا مذاق رکھنے والا محض انہی چیزوں میں وقت نہیں صرف کرسکتا تھا۔ اگر اوائل عمر اسی عیش پرستی میں گذرتی تو علمی مذاق جس سے ان کی تمام زندگی پُر ہے کس وقت پیدا ہوتا بہرصورت یہ واقعات کسی خاص مقصد کے حاصل کرنے کی غرض سے درج کئے گئے ہیں۔ ان کو مستند تاریخ نویسی سے کوئی تعلق نہیں۔ اصول یہ ہے کہ جب مؤرخ کسی خاص خیال کو مدنظر رکھ کر تاریخ لکھتا ہے تو اس کو واقعات دستیاب ہو ہی جاتے ہیں مگر اس کا منشا چھپتا نہیں ضیاء الدین برنی (مؤرخ) جو محمد بن تغلق سے خفا تھے اُس کی قابلیت اور استعداد کو چھپا نہ سکے۔ عبدالقادر بدایونی نے اکبر کو ملحد، کافر، مشرک، غرض سب ہی کچھ ثابت کرنا چاہا مگر پھر بھی ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں جن سے انکار نہیں ہوسکتا حضرت شیخ عبد الحق محدّث دہلوی کی ایک تاریخ "تاریخ حقی" کے نام سے نوادرات میں ہے جس کا آخری حصہ یعنی محض دعائیہ کلمات الیٹ صاحب نے بطور نمونہ ترجمہ کرکے درج کئے ہیں۔ یہ کلمات اس کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں کہ اکبر ملحد اور منکر اسلام نہ تھا۔ ورنہ حضرت محدّث کا ایسا جلیل القدر عالم کبھی بھی اس کے لئے ایسے دعائیہ الفاظ استعمال نہ کرتا اسی طرح مصنف تاریخ اودھ

کے بیان کردہ واقعات کو زیادہ اہمیت دینا نہیں چاہئے اور صرف اس قدر سمجھ لینا چاہئے کہ واجد علی شاہ کی ابتدائی زندگی سیاسیات سے الگ ذاتی مشاغل میں گذری جس میں اگر عیش پرستی کا جز و تھا تو علوم و فنون سے دلچسپی کا بھی کافی حصہ تھا۔ تاہم چند واقعات اس ابتدائی زمانہ کے قابل ذکر ہیں جن میں سب سے پہلا واجد علی شاہ کی پہلی شادی کا ہے۔ یہ پندرہ سال کی عمر میں ہوئی، اس وقت نصیر الدین حیدر زندہ تھے اور واجد علی شاہ کے دادا محمد علی شاہ تخت نشین نہیں ہوئے تھے نہ اُنکی تخت نشینی کی کوئی اُمید تھی لہذا یہ شادی بھی دوسرے امراء کے لڑکوں کی سی تھی نہ کہ خاص شاہی خاندان کی سی، وکیل السلطنت نواب یوسف علی خاں بہادر صمصام جنگ کی بیٹی سے عقد ہوا جو اعظم بہو کہلائیں یہ واقعہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء کا ہے،

دوسرا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ واجد علی شاہ کے دادا محمد علی شاہ نے ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں انتقال کیا اور ان کے والد امجد علی شاہ بادشاہ ہوئے واجد علی شاہ کا ولی عہدی کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ واجد علی شاہ کے ایک بڑے بھائی مرزا مصطفےٰ علی حیدر تھے جن سے امجد علی شاہ کسی قدر ناراض تھے چنانچہ انھوں نے واجد علی شاہ کو ولی عہدی کے لئے منتخب کیا۔ یہ واقعہ خود اس کا ثبوت ہے کہ واجد علی شاہ کی ولی عہدی اور نیز بادشاہت محض اتفاقات پر مبنی نہ تھی بلکہ امجد علی شاہ نے اپنے بڑے بیٹے کو اس عہدۂ جلیلہ کے لئے اس قدر مناسب نہیں سمجھا جتنا کہ واجد علی شاہ کو۔

واجد علی شاہ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے ایک تاریخ

مسند نشینی یہ ہے ؎

شہ عدل پرور سلیمان حشم	فزوں رتبہ تخت شاہی نمود
زملک و ملک ایں صدا شد بلند	ملک رونق تاج شاہی فزود

ابو المظفر ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطانِ عالم واجد علی شاہ بادشاہ، لقب ہوا۔

بخیال آسانی وسہولت ذرا اُس کے لحاظ سے واجد علی شاہ کے دورِ سلطنت کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) امین الدّولہ کا دور۔ ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ سے ۱۹ رجب ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء تا ۹ جولائی ۱۸۴۷ء (۲) علی نقی خاں کا دور ۲۲ شعبان ۱۲۶۳ھ مطابق ۵ اگست ۱۸۴۷ء سے تا حکم ضبطی ریاست یعنی ۲۹ جمادی الاوّل ۱۲۷۲ھ مطابق ۷ فروری ۱۸۵۶ء۔

امین الدّولہ کا دور ۱۸۴۷ء

امین الدّولہ امجد علی شاہ کے وزیر تھے۔ واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد انھوں نے سبکدوشی کا ارادہ کیا۔ رزیڈنٹ سے جاکر انھوں نے صاف صاف یہ کہا کہ باپ کا نوکر بیٹے کے یہاں کبھی بھی مقبول نہیں ہوتا میں اپنے حسنِ خدمات کو مٹانا نہیں چاہتا بادشاہ جس کو چاہیں بخوشی وزیر بنالیں میں خود دستکش ہوتا ہوں۔ مگر رزیڈنٹ نے اُن کو روکا اور بادشاہ سے اُنکے متعلق دریافت کیا۔ اس وقت تک واجد علی شاہ غالباً ان سے ناخوش نہ تھے انھوں نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور رزیڈنٹ کو یقین دلایا کہ وہ

امین الدولہ کو ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو اس جگہ پر نہیں رکھنا چاہتے امین الدولہ نے اس کے بعد ملکۂ آفاق اور ملکۂ کشور یعنی بادشاہ کی دادی اور ماں سے بھی یہی عرض کیا اور دونوں نے اُن کو اطمینان دلایا نتیجہ یہ ہوا کہ امین الدولہ نے وزارت کا کام بہ اطمینان مستقل طور پر کرنا شروع کیا مشکل سے چار مہینے گذرے تھے کہ ان کو معزولی کا حکم ہوا اور یہ عزت و آبرو کے ساتھ اس عہدۂ جلیلہ سے دستکش ہو گئے رزیڈنٹ کو بادشاہ کی یہ حرکت ناگوار ہوئی اور یہ پہلا واقعہ واجد علی شاہ کے دور کا تھا جس میں بادشاہ اور رزیڈنٹ کے درمیان کشیدگی ہوئی۔

امین الدولہ کی برخواستگی کے اسباب مختلف بیان کئے جاتے ہیں جن میں ایک یہ بھی تھا کہ ایک روز رزیڈنٹ بادشاہ سے ملک کی بدانتظامی کا حال بیان کر رہے تھے اور اصلاح کے متعلق تقاضائے شدید ہو رہا تھا امین الدولہ موجود تھے انھوں نے رزیڈنٹ سے کہا کہ ابھی بادشاہ کو تخت نشیں ہوئے کتنے روز ہوئے رفتہ رفتہ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہو رہے گا رزیڈنٹ خاموش ہو گئے بادشاہ کو یہ گمان ہوا کہ رزیڈنٹ اور وزیر کی سازش ہے اور امین الدولہ ہی اس شدید تقاضے کے باعث ہیں۔ اصل مطلب یہ ہو کہ دونوں جگہ ان کا رسوخ بڑھے لہذا اس سلسلہ ہی کو ختم کر دینا چاہئے بہر صورت وجہ کچھ بھی ہو اس معزولی سے سلطنت کو نقصان ہوا۔ دربار اور رزیڈنسی کے تعلقات میں کشیدگی کی ابتدا ہو گئی اور رزیڈنٹ کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ تجربہ کار اور کار دان لوگوں کو بادشاہ پسند نہیں کرتے بلکہ گویوں اور خواجہ سراؤں

کی صحبت کے دلدادہ ہیں اور امور سلطنت میں بھی یہی غیر ذمہ دار اور ناقابل لوگ دخیل ہیں اور ہوتے جارہے ہیں۔

امین الدولہ کی معزولی کا ایک اور رخ بھی ہے۔ واجد علی شاہ نے انکے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جو نصیر الدین حیدر نے آغا میر کے ساتھ کیا تھا۔ نہ رزیڈنٹ کو ان کی جان اور مال کی حفاظت کی دقت اٹھانا پڑی۔ آغا میر نصیر الدین حیدر کے باپ کے وزیر تھے اور ان کی معزولی کے بعد ان کی دولت اور مکانات بھی لوٹے گئے تھے بلکہ اگر رزیڈنٹ نے ان کی حفاظت کا انتظام نہ کر دیا ہوتا تو جو کچھ ان کے ساتھ کا برتاؤ ہوا تھا وہ ان کے دشمنوں کے ہاتھ لگتا۔ واجد علی شاہ کی شرافت نے اس قسم کے واقعات سے شہر کو محفوظ رکھا اور وہ تلاطم جو ایسے موقعوں پر چند سال قبل ہوا کرتا تھا نہ ہوا۔

یہاں پر اس دور کا ایک اور واقعہ جو امین الدولہ ہی کی ذات سے متعلق ہے بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک روز صبح ان کی سواری جارہی تھی کہ گولا گنج کی سڑک پر پانچ بدمعاشوں نے آکر گھیر لیا اور ان کو زمین پر گرا کر چھری سینہ پر رکھ دی۔ تمام خلقت جمع ہوگئی اور خبر رزیڈنٹ تک پہونچی مگر چونکہ بدمعاش یہ ڈراتے تھے کہ اگر کسی نے قریب آنے کی ہمت کی تو ہم وزیر کی جان لے لیں گے اس لئے سوائے روپیہ پیسہ کی لالچ کے اور کوئی صورت نہیں نکلی۔ رزیڈنٹ نے ۷۵ ہزار کے بدلے میں ان کو راضی کیا اور جان بچائی یہ واقعہ بھی عجیب ہے۔ شہر کی بدانتظامی کا یہ بہت ہی بیّن ثبوت ہے۔ نیز اس واقعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وزیر اور دربار کے بڑے سے بڑے عہدے دار کی

وقعت عوام کی نگاہ میں کس قدر کم ہو گئی تھی۔ رزیڈنٹ کے وعدے اور انکے توسل کے بغیر کوئی معاملہ طے نہیں ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ یہ دوعملی حکومت تھی جو خرابیٔ انتظام کا سبب ہوئی۔ اس زمانے میں اودھ کی حالت اتنی ہی خراب تھی جتنی کہ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں بنگال کی تھی۔

قبل اس کے کہ اس دور کے حالات ختم کئے جائیں بادشاہ کی ایک مفید اصلاح کا تذکرہ ضروری ہے۔ واجد علی شاہ نے رعایا کی شکایات رفع کرنے کے لئے ایک نیا طریقہ نکالا تھا۔ بادشاہ کی سواری میں دو ترک سوار دو نقرئی صندوق لئے ہوئے چلتے تھے جن کی کنجی بادشاہ کے پاس رہتی اور ہر شخص کو اس کا حق تھا کہ وہ اپنی درخواست ان صندوقوں میں ڈال دے۔ بادشاہ ان صندوقوں کو اپنے ہاتھ سے کھول کر عرضیاں دیکھتے اور حکم لکھتے تھے۔ اس نئی اصلاح کا نام "مشغلۂ نوشیروانی" رکھا گیا۔ مجتہد العصر نے اس اصلاح کی تعریف میں بادشاہ کو ایک خط لکھا تھا جس کے چند فقرے نقل کئے جاتے ہیں۔

انشاءاللہ المتعال ایں دوحۂ عدالت گستری آئندہ مثمر ثمر بہتری خواہد شد۔ ؎

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

واقعی رعایا کی بادشاہ تک رسائی ان چند خوبیوں میں سے ایک ہے جو شخصی حکومت کے مفروضہ اصول کے لئے بیان کی جاتی ہیں۔

شاہان مغلیہ کا بھی یہ روزمرہ کا معمول تھا چنانچہ بادشاہ نامہ میں شاہجہاں کے متعلق لکھا ہے کہ جھروکۂ درشن میں صبح بیٹھ کر جہاں نوج کی

حالت دیکھتے تھے ساتھ ہی ساتھ جمنا کے کنارہ کے کھلے ہوئے میدان سے ڈوریوں کے ذریعہ سے مستغیثوں کی عرضیاں بھی پہنچتی تھیں جن پر خود دستخط کرتے اور احکام لکھتے ممکن ہے کہ واجد علی شاہ نے جن کی علمی واقفیت بہت ہی اعلیٰ درجہ کی تھی اس مشغلۂ نوشیروانی کی مثال شاہان ماضیہ کے حالات میں دیکھی ہو۔ بہرصورت اصول نہایت ہی عمدہ تھا مگر بادشاہ نے چند دنوں سے زیادہ اس پر استقامت نہیں کی۔ چنانچہ سلیمن اور اوٹرم جن کی رپورٹوں پر ضبطی ریاست کا حکم ہوا ہے واجد علی شاہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ رعایا کی دادرسی کے ذرایع بہت ہی محدود ہیں اور یہاں محکمۂ عدل نہایت ہی ابتر اور خراب حالت میں ہے۔

علی نقی خاں کا دور

امین الدولہ کی معزولی اور علی نقی خاں کے تقرر میں قریب ایک مہینہ کا فصل ہے۔ اس درمیان میں وزارت کے انتخاب کے لئے کم از کم تین شخصوں کے متعلق گفت وشنید ہوئی۔ امیر الدولہ، شرف الدولہ اور علی نقی خاں امیر الدولہ نے کچھ دنوں کام بھی کیا مگر اتفاق سے اسی زمانے میں ہنود دکانداروں نے ایک مندر کے کھود دے جانے کے سلسلہ میں عام ناراضگی کا اظہار کیا اور دوکانیں بند کر دیں۔ رزیڈنٹ تک شکایت پہنچی اور تمام ساہوکار رزیڈنسی کے میدان میں جمع ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ امیر الدولہ کی چندروزہ وزارت کا خاتمہ ہو گیا۔ شرف الدولہ کے نہ ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مہاراج بالکرشن

نے جو دیوان ریاست تھے بادشاہ کے مصاحبین خاص "رضی الدولہ" اور قطب الدولہ کو جاکر سمجھایا کہ آپ یہ کیا غضب کرتے ہیں "لکڑی کی کھونٹی اکھاڑ لوہے کی میخ جڑتے ہیں" اس کے بعد انھی کی تجویز سے علی نقی خاں کا نام تجویز ہوا مصنف مرقع خسروی کا بیان ہے۔

(مہاراجہ بالکرشن) نے بہر نمط یہ کہا کہ بے ادبی معاف شرف الدولہ کی سطوت کی پناہ نہیں ان کے ہوتے کسی کا نباہ نہیں آپ مجھ سے... چھپن ہزار روپیہ نقد لیں اور علی نقی خاں کو اپنا کر کے بٹھا دیں وہ سادہ سیدھا نواب زادہ کم جرأت آسایش پسند ہے کھیل کود کا عادی ہے... وہ نام سمی سے رہیں گے آپ صاحب جو چاہیں گے سو کریں گے.... الغرض یہ دونوں بادشاہ پاس گئے ......بس حقیقت میں یہ دونوں دل وجان تھے اور حضرت صرف کہنے کے سلطان تھے وہاں کیا تھا جو انھوں نے کہا وہ ہوا ...."

غرض علی نقی خاں وزارت کے عہدہ پر سرفراز ہوئے اور تا وقت انتزاع سلطنت وزیر رہے۔

اس دور کے واقعات کو بہ لحاظ تقدم و تاخر تاریخی بیان کرنا بہتر ہے لہذا سن وار بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے قیصر التواریخ اور تاریخ اودھ دونوں نے اس کی کوشش نہیں کی بلکہ بغیر لحاظ تقدم و تاخر واقعات کو جس طرح بنا ایک سلسلہ میں بیان کر دیا ہے۔ تاریخی حیثیت سے یہ صورت غلط ہے اور اسی سے تاریخ اودھ کی اس وقت تک تدوین نہیں ہو سکی مصنف قیصر التواریخ نے تو زیادہ

اپنا موضوع ان واقعات کا بیان کرنا قرار دیا ہے جو اُن کی نظر میں تعجب خیز سننے یا عام دلچسپی کے تھے اور اس کا خیال بالکل نہیں کیا کہ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے بعض موقعوں پر محض ذاتی حالات ہیں جن کا تاریخ نویسی سے مطلق تعلق نہیں مثلاً ایک سرخی "سرگشتگی تقدیر مصنف کتاب و موقوفی عملہ رسد خانۂ سلطانی" بھی ہے تاریخ اودھ جو قریب بیس سال قبل لکھی گئی ہے دراصل واقعات کا ایک ذخیرہ ہے مگر اس کے مصنف نے بھی قطعی مؤرخانہ انداز نہیں اختیار کیا ہے اور واقعات کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ شاہ اودھ کی زندگی کے نہایت ہی تاریک پہلو پر ایسی روشنی پڑے کہ دیکھنے والوں کو صرف تاریکی کا احساس ہو اور تصویر کا دوسرا رُخ بالکل سامنے نہ آئے چنانچہ جلد پنجم کا بہت بڑا حصہ واجد علی شاہ کی حسن پرستی عیش و عشرت اور شباب کے مفصل حالات میں صرف کیا گیا ہے گویا کہ مصنف صاحب نے اُردو میں رینالڈس کا کام کیا اور مسٹر ریز (Mysteries) کا جواب تیار کر دیا ایسی حالت میں واقعات کو تاریخی حیثیت سے ترتیب دینا اور پھر سن وار مرتب کرنا آسان نہیں۔ بہر حال اس کی پہلی مرتبہ کوشش کی جاتی ہے کہ اس دور کی تاریخ مدون ہو جائے اور تاریخی اصول پر آجائے۔

۱۸۴۷ء میں علی نقی خاں وزیر ہوئے اور چند دنوں کے بعد سفارت کے عہدہ میں تبدیلی ہوئی۔ مصلح السلطان جو سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نواب آصف الدولہ کے وزیر کے خاندان سے تھے اس جرم پر برطرف کر دیئے گئے کہ انھوں نے بادشاہ کے خوف سے رزیڈنٹ کو پورا پیغام نہیں پہونچایا۔ رزیڈنٹ نے خود آکر جواب مانگا جس پر بادشاہ نے ناواقفیت کا اظہار کیا اور مصلح السلطان کے

ساتھ گئی لیکن مصنف تاریخ اودھ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصلح السلطان نے الزام اپنے اوپر اوڑھ لیا غلطی اُن کی نہ تھی اور اسلئے دربار سے وہ معتوب نہیں ہوئے۔

۱۸۴۷ء کے اخیر میں یعنی نومبر کے مہینے میں ایلیٹ صاحب جن کی مشہور تاریخی ذخیرے کی بدولت ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ محفوظ ہے لکھنؤ آئے یہ اس وقت گورنر جنرل کے فارن (Foreign) سکریٹری تھے۔ بادشاہ سے ملاقات ہوئی کتب خانۂ شاہی کو دیکھا اور منتخب کتابیں تاریخی لے گئے۔ شاید گھریلو کتبخانوں کا بھی اُن کو پتہ چلا چنانچہ وصی علی خاں جو اس دور کے مشاہیر سے تھے انھوں نے بھی بخیال رسوخ نوادرات پیش کئے اور ایلیٹ صاحب سے ان بیش بہا ذخیروں کے بدلے تعلقات پیدا کئے۔

نومبر ۱۸۴۷ء مطابق ذیقعدہ ۱۲۶۳ھ لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل لکھنؤ آئے۔ گورنر جنرل کی آمد بھی شاہ اودھ کے لئے نہایت زیر باری کا موقع ہوا کرتا تھا۔ تمام لشکر اور عملہ کی نئی پوشاکیں بنتی تھیں۔ راستے درست کئے جاتے تھے جاڑے پانی کے لئے کانپور سامان بھیجا جاتا تھا جس میں ہزارہا روپیہ خرچ ہوتا تھا غرض بادشاہ اور رعایا کے بہت کچھ ماتھے جاتی تھی اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا اوّل تو بادشاہ خود بڑے شوقین، اور پھر نواب گورنر جنرل کی خوشنودی خاطر کے لئے کون کہہ سکتا تھا کہ خرچ میں کمی کی جائے غرض لاکھوں کے وارے نیارے ہوئے مصنف قیصر التواریخ جو واجد علی شاہ کے ہمعصر تھے بیان کرتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر کا خانساماں جو خالی کشتیاں لینے آیا تھا اُسے سات پارچہ کا خلعت اور ایک ہزار روپیہ شاہ اودھ کی طرف سے دیا گیا۔ ایک اور ہمعصر کلھ

بیان ہے کہ "حضرت نے زرد وزی وردیاں رنگ رنگ کی ہر فرقہ کو بٹوائیں.... ....یہاں تک کہ لکھنؤ سے کانپور تک برابر میلہ ہوگیا" بادشاہ سے تخلیہ کی ملاقات میں گورنر جنرل نے بہت کچھ درستی انتظام اور بیدار مغزی کی تاکید کی۔ کہا جاتا ہے کہ گورنر جنرل نے بادشاہ کو متنبہ کیا کہ اگر دو برس کے اندر ملک کا انتظام درست نہ ہوگا تو سرکار کمپنی کو انتظام سلطنت میں ایسی تبدیلی کرنا پڑے گی جس کا اثر بادشاہت پر پڑے گا گویا کہ معزولی کی دھمکی دی مگر بادشاہ نے کمال بے تکلفی سے گورنر جنرل کا دامن ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ لارڈ ہسٹنگز نے جو سلوک نواب سعادت علی خاں کے بعد کئے وہ ظاہر ہیں اور لارڈ آکلینڈ نے محمد علی شاہ کو صاحب تخت و تاج بنایا اگر آپ بھی بنظر حقوق میرے اسلاف کے میرے واسطے امر جدید جو مزید محبّت کا باعث ہو تجویز فرمائیں تو کچھ بعید نہ ہوگا اور جس وقت تک آپ اقرار نہ فرمائیں گے ہاتھ آپ کے دامن سے نہ اٹھاؤں گا۔ چنانچہ گورنر جنرل کو بادشاہ کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ انھوں نے جواب میں شفقت کے کلمات کہے اور تسکین بخش وعدہ کیا کہ میں آپ کو ہر طرح کی مدد دوں گا بہر حال رعایا کی بہبودی کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ یہی صورت استحکام کے قائم رکھنے کی ہوسکتی ہے۔ گورنر جنرل نے لکھنؤ سے رخصت ہوتے ہوئے رزیڈنٹ کو اودھ کے معاملات کے متعلق بہت کچھ ہدایتیں دیں جن کا ماحصل یہ تھا کہ ممالک محروسہ اماکن اس طرح پر نہ دیا جائے کہ آج ایک ناظم اور کل دوسرا اس لئے کہ ایسی صورت میں رعایا کو کوئی مستقل فائدہ نہیں ہوتا۔ ہر ناظم یہ سمجھتا ہے کہ میں کل نہ ہوں گا لہذا جس قدر ہوسکے وصول کرلوں۔ ایسی

صورت میں مستاجری طریقہ سے بھی زیادہ نقصان رعایا اور بادشاہ دونوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے دوسرے پرگنوں پر تھانہ جات مقرر کئے جائیں تاکہ رعایا کی حفاظت اور امن و امان کا انتظام ہو سکے تیسرے سپاہ فوج انگریزی کے اکثر مقدمات اودھ میں دایر رہتے ہیں جن کا فیصلہ مدت تک نہیں ہو سکتا اس لئے ایک الگ محکمہ محض اس غرض سے کھولا جائے کہ ایسے مقدمات کا جلد سے جلد فیصلہ ہو جایا کرے۔

اس سلسلہ میں چند واقعات ناظرین کے سامنے پیش کرنا ضروری ہیں جن سے ان کو پورے طور پر اندازہ ہو جائے گا کہ یہ نیا محکمہ دادرسی کس قدر غیر ضروری اور سلطنت اودھ کے لئے نقصان دہ تھا۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ کمپنی کی فوج میں اودھ کے رہنے والے اس قدر کثرت سے بھرتی تھے کہ سلیمن صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ "قریب پچیس سال گذرے کہ حسب الحکم غازی الدین حیدر،

نوٹ:۔ امانی اور مستاجری دو طریقے اودھ میں محاصل سرکاری وصول کرنے کے تھے مستاجری تو ٹھیکہ داری کا اصول تھا ایک شخص سرکار سے ملک کے ایک حصہ کے محاصل وصول کرنے کا ٹھیکہ لے لیتا تھا اور سرکار کو کسی طرح کا عملہ وصولیابی محاصل کے لئے نہیں رکھنا پڑتا تھا مقررہ رقم ٹھیکہ دار یا مستاجر سے ملجاتی تھی۔ اس طریقے میں سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ ٹھیکہ دار رعایا سے محاصل سرکاری سے کہیں زیادہ وصول کرتا تھا اور گو کہ شاہی خزانہ میں مقررہ رقم پہونچ جاتی تھی مگر رعیت تباہ رہتی تھی جس کا انسداد بغیر اس طریقے کو توڑے ہوئے نہیں ہو سکتا تھا۔ انگریزوں نے کئی بار اس پر زور دیا کہ پورا ملک بتدریج امانی کر دیا جائے یعنی سرکاری عملہ محاصل شاہی کی تحصیل کیلئے مقرر کیا جائے

تحقیقات ہوئی تو صرف ایک ضلع بیواڑہ کے سولہ ہزار اور بودہ کے جو بیواڑہ سے پورب طرف واقع ہے پندرہ ہزار آدمی ہماری فوج اور دوسرے سررشتوں میں نوکر پائے گئے۔ یہ سپاہی پیشہ اودھ کے باشندے رزیڈنٹ کی طاقت اور انگریزوں کے نام سے حکام اودھ کے خوف کو خوب جانتے تھے چنانچہ انھوں نے ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا تھا جب ان کو اپنے گھر آنے کے لئے چھٹی کی ضرورت ہوئی تو یہ اپنی جائداد اور آراضی کے حکام کی غفلت اور ظلم و ستم سے چھین لئے جانے کا عذر لنگ بیان کرتے اور آٹھ آٹھ نو نو مہینے کی طویل رخصت لے کر گھر بیٹھتے جس سے ان کو بھی فائدہ تھا اور کمپنی کو بھی مروجہ فوجی قاعدوں کے موافق تنخواہ کم دینا پڑتی تھی بساتھ ہی ساتھ یہ اپنے افسروں سے رزیڈنٹ کے نام سفارشی خطوط لے آتے تھے جن کا منشا یہ ہوتا تھا کہ ان کی دادرسی ہو اور فیصلہ میں تاخیر نہ کی جائے۔ ان تحریرات کا یہ اثر ہوتا تھا کہ رزیڈنٹ عملہ شاہی کے نام حکم لکھ دیتے کہ ان کی دادرسی میں کوئی کمی نہ کی جائے اور جلد سے جلد ان کا فیصلہ کر دیا جائے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عملۂ شاہی رزیڈنٹ کے خوف سے اکثر ان کے دعوؤں کو خواہ وہ بے اصل ہی کیوں نہ ہوں صحیح تسلیم کر کے تنازعہ

تاکہ ٹھیکیداروں کے بجائے وصولیابی کیلئے ملک چھوٹے ٹکروں میں تقسیم ہو کر ہر حصہ ایک ناظم کے سپرد ہو جائے جو تحصیل وصول کا ذمہ دار ہو۔ ناظم کا فرض صرف یہ ہو کہ جس قدر بھی رقم صحیح طور سے وصول ہو سکے رعایا پر جبر و ظلم کے بغیر خزانۂ شاہی میں داخل کرے یعنی ناظم گویا کہ شاہی کارندہ تھا اور تحصیل وصول کے ساتھ ہی اس کا یہ فرض بھی تھا کہ رعایا کی دقتوں کو ملحوظ رکھے برخلاف اسکے متاجر کو محض ٹھیکیدار کی صورت سے اپنے زر ٹھیکہ کو ادا کرنا اور جسقدر ممکن ہو سکے بڑی سے بڑی رقم رعایا سے وصول کرنا تھا۔

جائداد دلوادیتا تھاچنانچہ سلیمن صاحب نے اپنی رپورٹ میں باوجود حکام اودھ سے خفگی کے اس بے اصولی کو صاف صاف تسلیم کیا ہے۔ ناظرین کے ملاحظہ کیلئے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

اگر رزیڈنٹ جلد باز و تیز مزاج ہوا تو بادشاہ و دربار و حکام ضلع وغیرہ کو دھمکاکر عجلت کے ساتھ ایسے استغاثوں کا فیصلہ کراتا ہے جس سے دوسروں کے استحقاق زائل ہوکر افسروں اور سپاہیوں کا فائدہ ہوتا ہے اور جو کہیں رزیڈنٹ زیادہ ایماندار نہ ہوا تو صاف حکم دیدیتا ہے کہ شئے متنازعہ سپاہی کو دلادی جائے تاکہ وہ یا اس کے افسر پھر نہ جھنگ کریں اس کا کچھ خیال نہیں رہتا کہ بنائے دعویٰ کیا ہے اس قسم کے بہت سے مقدمات رزیڈنٹ کے دفتر میں لکھے ہوئے ہیں افسوس صد افسوس یہ استحقاق رزیڈنٹ کے ہاتھ میں گویا ایذارسانی کا ایک ہتھیار ہے اور اس ہتھیار کو وہ ہر روز اودھ کے دربار پر چلاتا ہے اور جب موقع دیکھتا ہے یا جیسا اس کا مزاج ہوتا ہے یا جیسے سپاہیوں اور افسروں سے سابقہ پڑتا ہے ویسی ہی سختی یا نرمی کرتا ہے۔"

اس کے بعد سلیمن صاحب لکھتے ہیں:-

نہایت کثرت سے اور بیحد تکلیف وہ نالشیں سرکار اودھ یا ملازمان شاہی یا تعلقداروں کے اوپر بابت زیادہ ستانی کے ہوتی ہیں اور جب ان ملازمان شاہی اور تعلقداروں کو سپاہی کی جمع کم کرنا پڑتی ہے تو وہ انکے ہمسایوں کی جمع کس لیتے ہیں؛

اس کے بعد پھر لکھتے ہیں :-

اس طرح پر پشتہا پشت اور سیکڑوں برس کی موروثی حقداروں کے بہت سے حقوق چھن جاتے ہیں کیونکہ دربار سے اکثر بخوف ناکید رزیڈنٹ بلا تحقیقات حکم ہو جایا کرتا تھا کہ سایل کا اراضی متنازعہ پر قبضہ کرا دیا جائے اس سبب سے تلنگوں سے لوگ بہت ڈرتے ہیں "

اسی سلسلہ میں بہت سے صحیح واقعات کا سلیمن صاحب تذکرہ کرتے ہیں مثلاً لکھنؤ کے ایک دوکاندار کا واقعہ انھی کے الفاظ میں درج ذیل ہے :-

لکھنؤ کے ایک دوکاندار غلام جیلانی نے نفع کی یہ صورت دیکھ کر سوار کی وردی یعنی جاکٹ ٹوپی و بوٹ وغیرہ مع تلوار کے خرید کیا اور ایک پنشن یافتہ سوار ہونے کا حیلہ کر کے افسر فوج سے اپنی عرضیوں پہ دستخط کرا کے بذریعہ رزیڈنٹ واسطے تحقیقات کے دربار میں بھجوائیں یہ کام دس پندرہ سال تک کرتا رہا اور بہت کچھ فائدے اٹھائے آخر کار اس زمین پر قبضہ حاصل کیا کہ جس پر اس کا کچھ استحقاق نہ تھا۔ تھوڑے دن بعد اس نے ایک عرضی بھیجی کہ بیدخل شدہ زمینداروں نے اس کے چار عزیزوں کو مار کر اس کو نکال دیا اس پر زیادہ تحقیقات ہوئی تو اصلیت مقدمہ کی دریافت ہو گئی۔ اپنے مکتوب بنام رزیڈنٹ مورخہ ۱۶ جون ۱۸۳۶ء میں بادشاہ نے اس مقدمہ کے تذکرہ میں یہ لکھا تھا کہ اگر ایسا آدمی جس کو تمام لکھنؤ جانتا ہے پندرہ برس تک کامیابی سے ایسا پیشہ کر سکتا ہے تو دیہات کے آدمی جن کو کوئی نہیں جانتا کیسی آسانی سے اس قسم کی

کارروائی کر سکتے ہیں۔"

چنانچہ لارڈ ہارڈنگ بادشاہ کو بہت کچھ انتظام سلطنت کی فہمایش کر گئے اور ایک نیا محکمہ ان مقدمات کی تفتیش کے لئے کھولنے کی سفارش کر گئے ساتھ ہی ساتھ رزیڈنٹ کے اختیارات اور اندرونی معاملات میں آنکی دیکھ بھال کے اہم مسئلہ کے بابت بھی یہ رائے ظاہر کر گئے کہ انتظام سلطنت کی درستی اور رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے یہ تمام چیزیں ضروری ہیں مختصر یہ ہے کہ گورنر جنرل نے ظاہری ہمدردی میں کوئی کمی نہیں کی مگر اودھ کے ساتھ جو معاملت اس وقت ہو رہی تھی اور جو پالیسی طے کی جا چکی تھی اس کے مطابق ان کو چلنا ضروری تھا اس میں شک نہیں کہ لارڈ ہارڈنگ نے بمقابلہ لارڈ ڈلہوزی اظہار ہمدردی ضرور کیا اور واجد علی شاہ نے بھی ان کی ہمدردی حاصل کرنے میں نہایت درجہ فراست کو دخل دیا مگر اس کا اثر مستقل ممکن نہ تھا۔ ضبطی ریاست کسی نہ کسی نہج سے طے ہو چکی تھی اور مصالح وقتی کے لحاظ سے انگریزی سلطنت کے لئے مفید تھی لہذا رزیڈنٹ کے اختیارات میں زیادتی اور انتظام سلطنت کی جلد درستی اور درصورت عدم تعمیل احکام ضبطی کی دھمکی یہ تمام باتیں گورنر جنرل کی تشریف آوری بادشاہ کی ملاقات اور آؤ بھگت کا اصل نتیجہ ہوئیں جس کا الزام لارڈ ہارڈنگ پر بیکار ہے یہ محض حکومت کی پالیسی تھی جس پر گورنر جنرل کو عمل کرنا تھا۔

۱۸۴۸ء میں قیصر باغ کی بنیاد پڑی اور ۱۸۵۰ء میں تکمیل ہوئی مع اسباب اور سامان آرایش اس میں ۸۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ حرم شاہی کا قیام یہیں تھا علی نقی خاں بھی یہیں آ گئے تاکہ بادشاہ اور بیگمات سے قریب رہیں اور تمام

واقعات سے اطلاع ہوتی رہے۔ یہاں ایک بہت بڑا میلہ بھی سال میں ایک بار ہوتا تھا جس میں تمام اہل شہر شرکت کرتے تھے اور ہر شخص کو قیصر باغ میں آنیکی اجازت تھی۔ اس قسم کے مجمعے جن سے رعایا اور بادشاہ کے درمیان قریبی تعلق پیدا ہو سکے اخلاقی حیثیت سے کیسے ہی کیوں نہ ہوں مگر اس طرح دونوں کو ایک دوسرے سے اختلاط کا موقع ملتا تھا جو بادشاہوں کے لئے خاص کر نہایت ضروری اور بیحد مفید ہے اور اس سے نہ صرف ان کے تجربے اور واقفیت میں غیر معمولی اضافہ ہوتا تھا۔ بلکہ ان کو عام مقبولیت بھی حاصل ہوتی تھی۔

قیصر باغ کی تعمیر کی تاریخ، تاریخ اودھ کے حوالہ سے درج کی جاتی ہے ؎

چو قیصر باغ را تعمیر فرمود دل رضواں بہ جنبش گفت بارک
بصد جوش بہارش کلک شمشیر نوشتہ سال آں باغ مبارک
۱۲۶۴ھ

اسی سال یعنی ۱۸۴۸ء میں دو بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ اول تو لارڈ ہارڈنگ جنھوں نے شاہ اودھ کے ساتھ معاملت میں کسی قدر نرمی سے کام لیا تھا ولایت چلے گئے اور اُن کی جگہ لارڈ ڈلہوزی جن کے سر اودھ کی ضبطی کا سہرا بندھنا تھا گورنر جنرل ہوکر آئے۔ لارڈ ڈلہوزی کا نام دیسی ریاستوں کی تباہی کی تاریخ میں اسی قدر اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ لارڈ ولزلی کا۔ ان کا اصول ضبطی اور لارڈ ولزلی کا عہد معاونت دونوں دیسی ریاستوں کے لئے سمّ قاتل تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ ولزلی کے زمانے میں دیسی ریاستیں اس قدر کمزور نہ تھیں کہ ان سے جبریہ ملک لے لیا جاتا اور دوسرے انگریزوں کو فرانس اور اس کے انقلابی رہنما نپولین کا خوف تھا جس نے مصر پر حملہ کر کے انگریزوں کی ایشیائی طاقت کو

نیست و نابود کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا برخلاف اس کے دلہوزی کے زمانہ میں انگریزی سلطنت ہندوستان میں اس درجہ مضبوط ہو چکی تھی کہ اس کو کوئی خطرہ باقی نہ تھا سکھوں کی طاقت جو اس آخری دور کی سب سے بڑی دیسی طاقت تھی فنا ہو چکی تھی۔ بیرونی حملہ کا خوف بھی نہ تھا اسی لئے ایشیائی بادشاہوں میں سے کسی میں اس وقت دم نہ تھا صرف روس ایشیائی ترکستان، ایران، اور افغانستان کی طرف بڑھنے کی کوششیں کر رہا تھا مگر وہ بھی امید افزا نہ تھیں اس لئے کہ افغانستان کی گذشتہ جنگ کے بعد روسی حکومت کو اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ انگریز ہندوستان کی شمالی، مغربی سرحد سے کس قدر ہوشیار رہیں اور وہ روسی حکومت کی تمام حرکات اور تجویزات کو کس قدر غایر نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایسے زمانے میں لارڈ ڈلہوزی کا ہندوستان میں آنا گویا کہ سلطنت اودھ کے لئے فرشتۂ اجل کا ورود تھا جو لایستقدمون ساعتہ ولایستاخرون پڑھتا ہوا یہ صاف کہتا تھا کہ اب وقت آگیا ہے اور یہ کام میرے ہی ہاتھوں ہونا ہے۔

دوسری تبدیلی نومبر ۱۸۴۸ء میں رزیڈنسی کے عہدہ میں ہوئی کرنل رچمنڈ جو اس وقت رزیڈنٹ تھے بوجہ علالت ولایت روانہ ہوئے اور کرنل سلیمن رزیڈنٹ ہو کر تشریف لائے یہ کمپنی کے نہایت تجربہ کار افسروں میں تھے جنھوں نے فوجی اور دیگر خدمات نہایت جانفشانی اور کامیابی سے انجام دی تھیں۔ ان کی ملازمت ۱۸۰۹ء سے شروع ہوتی ہے اور ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۶ء تک یہ لکھنؤ میں رزیڈنٹ رہے۔ اس سے قبل انھوں نے بڑی

اہم خدمات انجام دی تھیں۔ نیپال کی جنگ میں انھوں نے حصہ لیا۔ قریب ۲۵ سال تک یہ ساگر و نربدا میں اسسٹنٹ ایجنٹ گورنر جنرل کے عہدہ پر مامور رہے۔ ۱۸۳۵ء میں ٹھگی کے انسداد اور تحقیقات کا کام ان کے متعلق ہوا۔ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۸ء تک یہ بندیلکھنڈ کے فساد کے انسداد کے لئے مقرر رہے اور ۱۸۴۲ء سے گوالیار کی رزیڈنسی کا کام بھی ان کے متعلق تھا۔ گویا کہ لکھنؤ آنے سے قبل یہ ہر قسم کی اہم خدمات انجام دے چکے تھے۔ چنانچہ ان کے تقرر کے موقع پر لارڈ ڈلہوزی کا خط جو درج ذیل ہے یہ بتاتا ہے کہ ان کا انتخاب اس عہدۂ جلیلہ کے لئے کچھ معنی رکھتا تھا:۔

مقام گورنمنٹ ہاؤس
۱۶ ستمبر ۱۸۴۸ء

مائی ڈیر کرنل سلیمن!

اس وقت ایک بات کا تجویز کرنا ہمارے اختیار میں ہے جس کو ہم خیال کرتے ہیں کہ آپ زیادہ پسند کریں گے اور جس کی انجام دہی سے آپ سرکار کو واقعی فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ کرنل رچمنڈ نے لکھنؤ کی رزیڈنسی سے استعفا دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ گورنر جنرل نے ۱۸۴۷ء میں شاہ اودھ کو بذریعہ تحریر یہ اطلاع دی تھی کہ اگر دو سال کے اندر سلطنت میں قرار واقعی اصلاح نہ ہوگی تو برٹش گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں انتظام لے لیگی۔ اب اس بات کی امید کرنے کی کوئی وجہ پائی نہیں جاتی کہ اکتوبر ۱۸۴۹ء تک کچھ بھی اصلاح وقوع میں آئے۔ ایک زرخیز اور مظلوم ملک کے انتظام اندرونی کی درستی اس افسر کے واسطے جس کا انتخاب اس کے لئے ہو ایک افضل اور بڑی مشقت کا کام ہے

اور گورنمنٹ اس کام کے واسطے ایک اعلیٰ درجہ کے لائق ملازم کو تجویز کرتی ہے۔
آپ کی شہرت عظیم، آپ کے تجربۂ انتظام ملکی آپ کے حالات رعایا سے واقف کاری کے خیال سے آپ کا نام کونسل آف انڈیا میں ہم نے لکھ بھیجا ہے کہ آپ ہی ایسے حاکم ہیں جس کے سپرد یہ اہم کام کر کے ہم پورا بھروسا کر سکتے ہیں کہ اس کا سرانجام حسب دلخواہ ہوگا اس لئے ہم آپ کو یہ مشورہ دیتے ہیں اپنی عزت سمجھتے ہیں کہ آپ لکھنؤ کی رزیڈنسی خاص کر اس بڑی تبدیلی کے خیال سے جو آیندہ ضرور ہونے والی ہے قبول فرمائیے۔"

"ڈلہوزی"

مندرجۂ بالا تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کرنل سلیمن کا تقرر "اس بڑی تبدیلی کا جو غالباً آیندہ ضرور ہونے والی ہے" (یعنی ضبطی سلطنت اور معزولی شاہ اودھ) اُس کا پیش خیمہ تھا۔ چنانچہ جنوری ۱۸۴۹ء میں کرنل صاحب نے لکھنؤ رزیڈنسی کا چارج لیا۔

اس زمانے میں بادشاہ کی علالت کی نہایت متوحش خبریں مشہور ہو گئیں چنانچہ نئے رزیڈنٹ نے بخیال تحقیق و تجسس خود جا کر عیادت کی۔ اور یہ دریافت کر لیا کہ خوانخواستہ کوئی مہلک مرض نہیں ہے۔ مالیخولیا اور خفقان کی شکایت ہے جس کی وجہ سے کام میں جی نہیں لگتا اور اطباء نے بھی افکار سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ چونکہ امور مملکت افکار اور ترددات کا سب سے بڑا ذخیرہ ہوتے ہیں لہٰذا بادشاہ امور ملکی کی طرف بوجہ علالت توجہ نہیں کرتے اور مصاحبین اور وزراء کی بن آئی ہے۔

اسی سال ۲۶ مئی مطابق ۲ رجب ۱۲۶۵ھ مرزا جاوید علی بہادر بادشاہ کے دوسرے بیٹے جو ولیعہد تھے اور کئی مہینے سے مبتلائے تپ دق وغیرہ تھے آخر مستسقی ہوکر مر گئے اور اپنے دادا امجد علی شاہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

قطعہ تاریخ وفات

رفت از دنیا ولیعہد شہنشاہِ جہاں — جوہر تیغ خلافت تہ نشیں شد ہائے ہائے
شد بزیر خاک پنہاں وارث تاج و نگیں — خاتم دست سلیماں بے نگیں شد ہائے ہائے
زیر داماں جناب حضرت خاقان ہند — زینت آغوش پاک حور عین شد ہائے ہائے
گفت ہاتف مصرع سال وفات او ہمیں — ماہ اوج سلطنت زیر زمیں شد ہائے ہائے

مگر بوجہ ناسازی مزاج بادشاہ کو اس کی مطلقاً خبر نہ کی گئی اور ولیعہد کا مرنا بادشاہ سے مخفی رہا۔

سلیمن صاحب کے آنے کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی جون ۱۸۴۹ء میں وزیر اور رزیڈنٹ میں تصادم کا موقع پیدا ہوگیا۔ مرزا وصی علی خاں جو نواب علی نقی خاں وزیر کے مشیر خاص تھے سلیمن صاحب کے حکم سے شہر بدر کئے گئے۔ مرزا صاحب نہایت تیز فہم، نکتہ رس اور تجربہ کار شخص تھے جنھوں نے دیسی ریاست اور انگریزی سلطنت دونوں کے اصول و قواعد سے واقفیت حاصل کی تھی۔ ان کے اخراج کا سبب مصنف تاریخ اودھ نے ان کے دشمنوں شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں اور نواب محمد خاں سفیر شاہی کی سازش بتلایا ہے۔ مولوی مسیح الدین خاں مرحوم سفیر شاہ اودھ نے اس واقعہ کو بہت تفصیل

سے اپنی کتاب (Oudh and its Govt) میں بیان کیاہے انھوں نے
سلیمن صاحب کی سراسر زیادتی دکھائی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ
جس وقت تک وصی علی خاں کا ایسا واقف کار بادشاہ اور وزیر کو مشورہ
دے سکتا تھا رزیڈنٹ کی ریشہ دوانیاں کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں اسی لئے
سلیمن صاحب نے ان کے اخراج پر اصرار کیا۔ وصی علی خاں کا اخراج
آسانی سے نہو سکا۔ بادشاہ نے رزیڈنٹ کو کئی بار لکھا کہ وصی علی خاں کا
بلا قصور اخراج کیوں کیا جا رہا ہے، رزیڈنٹ نے پہلے تو کرنل لو اور کا لفیلڈ
سابق رزیڈنٹوں کی تحریرات کا حوالہ دیا اور آخر کار برافروختہ ہوکر یہ جواب
دیا کہ وصی علی خاں کی ملازمت جاگیر یا موروثی جائداد نہیں ہے لہذا
ان کی برخواستگی کے لئے ان کے خلاف ثبوت فراہم کرنیکی کوئی حاجت نہیں۔

There is no necessity to prove his guilt and the appointment in posed on him is not his Jageer or here distry property. There fore it is not necessary at the time of his dismissal to investigate the proofs")

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ رزیڈنٹ نے بیجا زور اور دباؤ سے کام
لیا اور بجائے اس کے کہ قصور کے ثبوت کی کوشش کی جاتی محض ذاتی ملازم

کی طرح سے برخواستگی اور اخراج کا حکم دے دیا۔ وصی علی خاں کے پاس بہت سی سفارشی چٹھیاں موجود تھیں جن میں ان کی گذشتہ خدمات کی تعریف کی گئی تھی مثلاً ایلیٹ (Elliott) صاحب سکریٹری گورنر جنرل کی چٹھی جس میں انھوں نے ان کے کام کی تعریف کی تھی۔ یہ چٹھیاں انکی کارگذاری کے متعلق تھیں جو انھوں نے بحیثیت نماندار گورنر جنرل یا سکریٹری صاحبان کے دورہ کے موقع پر کی تھی۔ بہر حال ان کے عزل اور اخراج کے حکم سے پہلے معاملات کی تفتیش سے انکار کرنا قطعی زیادتی تھی۔

اس سے زیادہ سخت واقعہ یہ تھا کہ بادشاہ نے شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں کے اخراج کا حکم دیا۔ یہ سیدھے چھاؤنی میں چلے گئے اور رزیڈنٹ کے ایما سے وہاں رہنے لگے۔ کوتوال شہر جس کو ان کے اخراج کا حکم دیا گیا تھا بادشاہ سے زیادہ رزیڈنٹ سے خائف تھا اس نے ان سے چشم پوشی کی جب بادشاہ نے جواب طلب کیا تو کوتوال نے یہ عرض کیا کہ مجھ کو گھر سے کانپور روانہ کرنے کا حکم تھا۔ شہر کے ناکہ تک نکالنے کا حکم نہیں پہونچا۔ میں نے تعمیل حکم کی اگر وہ چھاؤنی میں رزیڈنٹ صاحب کے ایما سے ٹھہر گئے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

بہر صورت اس طرح کی دو عملی حکومت میں ہمیشہ یہی خرابیاں ہوتی ہیں۔ بادشاہ کے مشیر اور ہمراز سے رزیڈنٹ کو پرخاش اور بادشاہ کو رزیڈنسی کے جانے آنے والوں اور خفیہ اخبار پہونچانے والوں سے اختلاف ہونا ضروری تھا۔ اس میں سلیمن اور واجد علی شاہ کا اس قدر قصور نہ تھا

جتنا کہ اس طریقہ حکومت کا جس کا لازمی نتیجہ اس طرح کی غلط فہمیاں اور تصادم ہوتا ہے ناظرین کے ملاحظہ کے لئے میں سر ہنری لارنس کے ایسے قابل اور واقف کار انگریز کی تحریر پیش کرتا ہوں جس میں وہ اسی نتیجہ پر پہونچے ہیں :-

The Oude rulers have been no worse than monarchs so situated usually are, indeed they have been better than might have been expected.... Among her ministers have been as able individuals as are usually to be found in the east; and there have not been wanting good men and true as Residents It is the system that is defective; not the tools - - - - - - -

اودھ کے تاجدار کسی حالت میں اپنے ایسے حکمرانوں سے جن پر یہ پابندیاں عائد ہوں بدتر نہ تھے بلکہ کسی قدر بہتر ہی تھے۔ وزرا میں چند اس درجہ قابل تھے کہ کسی مشرقی ملک میں ان سے بہتر نہ مل سکیں گے اور ریزیڈنٹ صاحبان

ہیں بھی سچے اور عمدہ لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ اصل میں طریقۂ حکومت خراب تھا نہ کہ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں حکومت تھی۔"

غرض وصی علی خاں کا اخراج دربار اور رزیڈنسی کی شکررنجی کی بنا ہوا۔ علی نقی خاں اور سلیمن صاحب کے درمیان رنجش پیدا ہوگئی۔ اگر ان کا ایسا وزیر نہ ہوتا تو غالباً بادشاہ بہت جلد رزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے خوف سے انھیں برطرف کرکے کسی دوسرے کے ہاتھ کام سپرد کرتے مگر اول تو ان سے قرابت قریبہ تھی دوسرے نواب کی جائز اور ناجائز کوششوں کی بدولت بھی یہ صورت واقع نہ ہوسکی اور نتیجہ آخر کار انتزاع سلطنت ہوا۔

اسی سال ۱۸۴۹ء میں رصد خانۂ شاہی کے انگریز افسر "ولکاکس" ... کا انتقال ہوگیا اور رصد خانۂ شاہی جس کے قائم رکھنے میں ایک کثیر رقم صرف کی جاتی تھی بند کر دیا گیا۔ سلیمن صاحب کی ایک چھٹی مورخہ ۱۸ / جون ۱۸۴۹ء سے پتہ چلتا ہے کہ کسی انگریز کو ان کی جگہ پر مقرر کرنے کی کوشش کی گئی مگر ملک کی حالت خراب ہونے کی وجہ سے رزیڈنٹ صاحب نے رحم کھایا اور ایلیٹ صاحب کو لکھا کہ بادشاہ صاحب متوفی کی جگہ پر کسی کو رکھنا نہیں چاہتے اور ایسی خراب مالی حالت کو دیکھتے ہوئے بہتر ہے کہ اس معاملہ پر زور نہ دیا جائے۔

The court is very averse to the appointment of a successor to Welcox --- I don't think that a successor should be urged upon them in the present state of beggary

واقعہ یہ ہے کہ اودھ کے خزانے پر بیکار پنشن یافتہ اور کبھی کبھی کمپنی کے نکالے ہوئے انگریزوں کی بھاری تنخواہوں کا بھی بار ڈالا جاتا تھا اور رصد خانہ وغیرہ اسی لئے تھا کہ انگریزوں کی روٹی چلے فریڈرک جان شور کی مشہور کتاب
Fredrick John Shore "نوٹ آن انڈین افیئرس"
Notes on Indian affairs"
کا حسب ذیل اقتباس ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے :-

... who does not recollect the member of our civil service, after having been dismissed for malpractices with a positive order against his future employm was sent to Lucknow with a recommenda from the Governor General to the King ...... The same authority (Resident) has been exerted to induce the King To entertain English coachmen, gardener

musicians and all sorts of people whom the King had no wish to employ.

"کس کو ان صاحب کا قصہ نہیں یاد ہے۔ جو کمپنی کی ملازمت سے برخواست ہوئے تھے اور جن کے متعلق آیندہ ملازمت نہ دئیے جانے کے احکام تھے باوجود اس کے وہ گورنر جنرل کا سفارشی خط لے کر لکھنؤ روانہ کئے گئے ....

رزیڈنٹ اپنے اثر سے انگریز کوچبان، مالی، اور گوّیے وغیرہ کو شاہ اودھ کے یہاں نوکر رکھاتا ہے۔ باوجودیکہ ان کی بادشاہ کو بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔"

اسی سال ۱۸۴۹ء کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ صاحبان محل (شاہان اودھ کی وہ بیویاں جو خاص محل کے علاوہ ہوتی تھیں) کے متعلق بہت سے شکوک تھے مگر بادشاہ نے بخیال حفظ ناموس ان پر محلدار مقرر کی جو ان کے اطوار کی برابر نگہبانی کرتی تھی۔ اور اس کی تنخواہ انھی بیگمات کو دینے کا حکم ہوا۔ چونکہ یہ سب وثیقہ دار بھی تھیں۔ لہذا ان کے معاملات کا تعلق رزیڈنٹ سے بھی تھا سلیمن صاحب نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔ اور بیگمات کی کج ردی کو مانتے ہوئے محلدار کے تقرر کا حکم دیا۔

اسی سال (۱۸۴۹ء) بعد اجازت گورنر جنرل سلیمن صاحب ملک اودھ کے دورہ کے لئے تیار ہوئے۔ یہ دورہ ۱۲ نومبر ۱۸۴۹ء سے ۲۷ فروری ۱۸۵۰ء تک رہا۔

گویا کہ ۳ ½ مہینے میں پورا ہوا۔ ایک طویل دو جلدوں کی رپورٹ جو در اصل اس دورہ کا روزنامچہ ہے۔ ریزیڈنٹ صاحب نے تیار کر کے گورنر جنرل کے یہاں روانہ کی۔ اس میں نہایت تفصیل سے ملک کی زراعتی کیفیت، رعایا کی شکایات، زمینداروں کی سرکشی، شاہی حکام کی بدمعاملگی اور رشوت ستانی کے واقعات درج ہیں۔ اس سے زیادہ مفصل اور مشرح کوئی کتاب اودھ کی تمدنی اور اقتصادی حالات پر موجود نہیں۔ اس بیش قیمت علمی ذخیرہ کے لئے اہل علم کو سلیمن صاحب کا نہایت متشکر ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اودھ کے متعلق ہر قسم کی تاریخی اقتصادی اور دیگر معلومات کا یہ ایسا ذخیرہ ہے کہ ہر شخص کو جسے اس ملک کے متعلق تحقیقات کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر ہم کو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ سلیمن صاحب نے زیادہ تر تصویر کا ایک ہی رخ پیش کیا ہے اس سے انکار فضول ہے کہ اس دورہ کا مقصد بادشاہ کے خلاف شکایات سننا اور ایسے واقعات کو جمع کرنا تھا جس سے آیندہ کارروائیاں یعنی سلطنت کی ضبطی اور بادشاہ کی معزولی کے لئے قوی وجوہات فراہم ہو سکیں۔ اسی سے بادشاہ کو خود بھی اس دورہ سے اختلاف تھا۔

سر ارسکن پری (Sir Erskin Perry) نے اپنی کتاب "برڈز آئی ویو آف انڈیا" (Bird's Eye view of India) میں اس دورہ کی وجہ حسب ذیل الفاظ میں نہایت صفائی کے ساتھ بیان کی ہے:-

....Col Sleeman the Resident has prevailed upon the Governor -

-General to allow him to make a tour through the provinces which he has been engaged in for the last three months and during which he has been encouraging applications and receipts of petitions from all quarters. This no doubt is an extra-ordinary interference with the native government and not warranted by any treaty is contrary to them.

"کرنل سلیمن صاحب ریذیڈنٹ نے گورنر جنرل سے خط و کتابت کر کے ملک میں دورہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی ہے اور تین مہینے سے وہ دورہ کر رہے ہیں اور تمام اطراف سے عرضیاں اور درخواستیں صاحب کے ایما سے گذر رہی ہیں بے شک یہ ایک دیسی حکومت کے ساتھ غیر معمولی مداخلت ہے جس کا عہدناموں میں کہیں تذکرہ نہیں بلکہ میثاق اور عہد کے قطعی خلاف ہے"

بادشاہ نے خود بھی "بلوبک" کے جواب میں لکھا ہے کہ یہ دورہ ریزیڈنٹ کے اختیارات سے باہر ایک نئی چیز تھی مگر ہم نے اس کی اجازت دی اور کثیر رقم اس پر خرچ کی تاہم نتیجہ وہی نکلا کہ سلیمن صاحب نے لارڈ ڈلہوزی کے منشا کے مطابق نتائج اخذ کئے۔ عرائض اور شکایتی درخواستوں کے متعلق وہ یہ

لکھتے ہیں کہ "تین مہینے کے سفر میں صرف ۲۵ عرضیاں گذریں اگر کوئی اور حاکم دورہ کرتا ہے تو اس سے زیادہ گذرتی ہیں"

سلیمن صاحب کے دورہ کے زمانہ میں بادشاہ نے اپنے مصاحبین کو میجر برڈ اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کے کہنے سے برخواست کیا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۰ء کا ہے۔ سلیمن صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے میجر برڈ کے اس مشورہ سے اختلاف کیا اور مصاحبین کا اخراج ضروری نہیں سمجھا۔ ان کی رائے میں یہ علی نقی خاں وزیر کی سازش اور چالاکی کا نتیجہ تھا جس سے حکومت کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا بلکہ علی نقی خاں کا اثر بڑھ جانے کا احتمال تھا چنانچہ انھوں نے ۱۲ دسمبر ۱۸۴۹ء کی ایک چٹھی میں اسسٹنٹ ریذیڈنٹ برڈ صاحب کو یہ لکھا ہے کہ وزیر ہمارے ہاتھوں ان لوگوں کا اخراج کرانا چاہتا تھا تاکہ بادشاہ کو شکایت کا موقع نہ ہو اور ان کے اخراج سے اس کا یہ فائدہ ہے کہ اب بجائے ان کے وہ خود بادشاہ کا معتمد خاص بن جائے۔

....." the minister wished for the removal of those singers, provided it should be effected through us without his appearing to his master to move in the matter, and that he wished their removal solely with a view to acquire for himself the authority they had possesse

قطب الدولہ، رضی الدولہ، ثابت الدولہ وغیرہ مصاحبین کا اثر بادشاہ اور امور مملکت میں اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ علی نقی خاں کے تقرر اور امین الدولہ کی خانہ نشینی کے وقت وزارت کے امیدواروں میں انتخاب انھی سب کا کام تھا بادشاہ ان کی ہر بات پر عمل کرتے تھے اور یہ جو کچھ سمجھا دیتے تھے وہی ہوتا تھا۔

واجد علی شاہ نے الزامات کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ خواجہ سرا اور اس درجہ کے لوگوں کی مصاحبت کوئی نئی بات نہیں۔ الماس علی خاں وغیرہ بھی خواجہ سرا تھے مگر یہ جواب قطعی مہمل تھا اس لئے کہ الماس علی خاں وغیرہ کے زمانہ میں اور اس دور میں بڑا فرق تھا۔ آصف الدولہ کا زمانہ بڑی حد تک ایک خود مختاری کا دور تھا بجائے اس کے واجد علی شاہ کا زمانہ اس کے بالکل ہی برعکس ریزیڈنٹ کی حکومت کا دور ہے۔ دوسرے یہ کہ الماس علی خاں کے ایسے نمک حلال اور قابل ملازمین اور ان نو دولتوں کا کیا مقابلہ۔ ان میں سوا رقص اور سرود کے اور کسی چیز کی قابلیت نہ تھی۔ صرف قطب الدولہ تو پڑھا لکھا اور علم دوست بھی تھا باقی سب جاہل تھے۔ ناظرین کے ملاحظہ کے لئے میں انہیں سے ہر ایک کے متعلق ایک ہم عصر کی رائے نقل کرتا ہوں:-

مصاحبین خاص

۱۔ رضی الدولہ غلام رضا خاں ساکن بریلی حضرت کا منھ بولا بھائی۔

۲۔ قطب الدولہ ساکن بریلی ستار باز کلاونت بدل شرافت نہاد بے خلل مونس ولید یہ صاحب خطاب۔

۳۔ ثابت الدولہ ثابت علی لکھنؤ ڈھاڑی۔
۴۔ دراج الدولہ چھجو خاں اس کا بھائی۔
۵۔ انیس الدولہ چھوٹے خاں لکھنؤ کا سازندہ کرتبی۔
۶۔ مصاحب الدولہ انیس الدولہ کا حقیقی بھائی نبک نہاد شریف مادرزاد۔
۷۔ نجیب الدولہ غلام رضا خاں رضی الدولہ کا باپ۔

مصاحبین کے اخراج سے سلطنت کو کوئی فائدہ نہیں ہوا علی نقی خاں کا بادشاہ پر اثر ضرور دونا ہو گیا۔ ایک سال بعد جون ۱۸۵۱ئہ میں بادشاہ نے انکی تیسری بیٹی سے نکاح کر لیا جس سے اُن کا اثر اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔

اسی سال ۱۸۵۱ئہ ستمبر کے مہینے میں رزیڈنٹ گورنر جنرل کی ملاقات کو مع دفتر انگریزی و فارسی لکھنؤ سے چلے گئے۔ گورنر جنرل کانپور ہو کر شملہ سے کلکتہ واپس آئے مگر لکھنؤ باوجود قریب ہونے کے نہیں گئے جس سے شکوک پیدا ہو گئے مگر کسی کو اس کی امید نہ تھی کہ گورنر جنرل (لارڈ ڈلہوزی) اور رزیڈنٹ (کرنل سلیمن) دونوں سلطنت اودھ کی مدت حیات ختم کرنے کی فکر میں ہیں۔ رزیڈنٹ واپسی کے بعد بادشاہ سے حسب دستور ملے اور گورنر جنرل کے ہمراہ رامپور وغیرہ کے سفر کے واقعات بیان کئے مگر اس عقدہ کو انہیں کیا کہ لکھنؤ نہ آنے میں کیا حکمت تھی۔ کانپور میں راجہ درشن سنگھ اور مصلح السلطان سفیر شاہی حاضر خدمت ہوئے مگر گورنر جنرل نے محض راجہ کو خلعت دیکر رخصت کیا اور سفیر شاہی کو باریابی کی عزت بھی نہ حاصل ہوئی۔ یہ بات بھی نئی تھی جس کی کھٹک دلوں میں پیدا ضرور ہوئی مگر اس کے آیندہ نتائج کی کسی کو کیا خبر ہو سکتی تھی۔ اور کون

ان تمام واقعات کو انتزاع سلطنت کا پیش خیمہ سمجھ سکتا تھا۔

جولائی ۱۸۵۴ء میں سلیمن صاحب رخصت لے کر بخیال تبدیل آب و ہوا لکھنؤ سے روانہ ہوئے ان کی جگہ پر جنرل اوٹرم رزیڈنٹ مقرر ہو کر آئے انھوں نے اوائل ۱۸۵۵ء میں اپنے نئے عہدہ کا چارج لیا۔ یہ ان قابل افسروں میں سے تھے جو کمپنی کے لئے مایۂ ناز تھے مگر سلطنت اودھ کے معاملات سے ان کو بالکل واقفیت نہ تھی۔ انھوں نے آتے ہی حسب الحکم رپورٹ تیار کرنا شروع کی جو در اصل سلیمن صاحب کی رپورٹ کا ضمیمہ تھی۔ یا صرف آواز بازگشت دونوں رپورٹوں کا مقصد ایک ہی تھا یعنی شاہ اودھ کی امور ملکی سے غفلت اور ملک کی تباہی کا نہایت ہی مؤثر الفاظ میں بیان تاکہ انتزاع سلطنت کیلئے وجوہ فراہم ہو جائیں۔ مگر اوٹرم کو ملک اودھ کے دورہ کا بھی موقع نہ ملا کہ وہ سلیمن صاحب کی طرح کچھ نئے واقعات قلم بند کرتے۔ انھوں نے محض رزیڈنٹی کے دفتر کی اطلاعات پر اعتماد کیا اور اپنی رپورٹ میں صاف لکھ دیا کہ میں اپنی عدم واقفیت اور ملک کے حالات سے بیگانگی کی وجہ سے دفتر رزیڈنٹی کے کاغذات کو اپنی رپورٹ کا ماخذ بناتا ہوں۔

"In the absence of any personal experience in this country I. am, of course entirely dependent for my information what I find in the Residency records" (Outram's letter to the Secretary to the Govt. dated March 15, 1855)

اوٹرم کی رپورٹ جو اودھ پیپرس (Oudh Papers) میں موجود ہے (۷) عنوانوں پر تقسیم ہے ۔

(۱) بادشاہ اور وزیر۔

(۲) محکمہ مال اور پولیس ۔

(۳) عدالتیں۔

(۴) فوج ۔

(۵) سڑکیں اور دوسرے رفاہ عام کے متعلق کام ۔

(۶) جرائم ۔

(۷) مظالم وغیرہ۔

گویا کہ اوٹرم صاحب نے اخیر دور کے نظام سلطنت کو مجملاً بیان کرتے ہوئے ملک کی عام حالت کا خاکہ کھینچ دیا۔

انھوں نے گورنر جنرل کی ہدایت کے مطابق حرف بحرف عمل کیا اور سلیمن صاحب کی رپورٹ کو تسلیم کر لیا۔ غرضکہ یہ صورت پیدا کر دیگئی کہ لارڈ ہارڈنگ گذشتہ گورنر جنرل کی ہدایات پر بادشاہ کاربند نہ ہوئے اور نہ ملک کی ابتری کم ہوئی۔ چونکہ سلیمن صاحب کی رپورٹ کا خلاصہ بھی یہی تھا لہذا اسی کو دوسرے الفاظ میں اوٹرم صاحب نے بھی لکھ دیا تاکہ زیادہ قابل اعتبار ہو۔ مسیح الدین خاں سفیر شاہ اودھ نے لندن میں اس رپورٹ کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے:-

"......this report so compiled by orders of Lord Dalhousie was nothing but a hypocratical ruse on his part, since it was neither more nor less than the substance of what had been recorded years before"

(یہ رپورٹ جو لارڈ ڈلہوزی کے حکم سے مرتب ہوئی گورنر جنرل کی ایک چال تھی
اس لئے کہ اس میں کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ انہی چیزوں کا اعادہ تھا جو پہلے
قلم بند ہو چکی تھیں)

دوسرے سال (جولائی ۱۸۵۵ء) واجد علی شاہ کے دور کا سب سے
ہیبت ناک واقعہ رونما ہوا۔ اجودھیا کے بیراگیوں نے ایک مسجد کو شہید کیا اور
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ مولوی امیر علی سنی المذہب
صوفی منش بزرگ جو قصبہ امیٹھی کے رہنے والے تھے جہاد کے لئے تیار ہوئے
اور ان کے ساتھ بہت سے مسلمان اس کو مذہبی فریضہ سمجھکر جان و مال فدا
کرنے کے لئے اجودھیا کی طرف راہی ہوئے۔ حدیقۃ الشہدا ایک رسالہ اس
واقعہ کے تفصیلی حالات میں بعد شہادت مولوی امیر علی صاحب شہید چھپا مگر
ضبط ہو گیا اس میں واقعات کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ یہ واقعہ اس قدر عام
دلچسپی کی چیز بن گیا کہ ہزارہا نظمیں اس کے متعلق تصنیف ہو گئیں۔ لوگوں نے

کمال عقیدتمندی سے مولوی امیر علی شہیدؒ کو حضرت امام حسین علیہ السلام سے مشابہت دی اور اس واقعہ کو کربلا کے عظیم الشان واقعہ سے تشبیہہ دی چنانچہ ایک طویل نظم کا جس کے اکثر اشعار کسی حد تک ناقابل اعادہ ہیں، ایک مصرعہ یہ ہے۔

۶۔ امیر علی چوں حسین شہید

سرفروشوں سے انسان کو قدرتی ہمدردی ہوتی ہے۔ یہ مشہور ہے کہ مولوی صاحب نے اپنے شہادت کے واقعہ کی خبر بہت پہلے دی تھی اور اس کی تاریخ بھی خود کہی تھی۔ قیصر التواریخ مولفہ مولوی کمال الدین حسینی حسنی سے جو اس واقعہ کے بیان میں جانب دارانہ یا فرقہ دارانہ پہلو نہیں رکھتی چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔

"نواب جعفر علی خاں مرحوم فیض آباد سے آتے تھے راہ میں یہ ہنگامہ دیکھ کر آئے اور اپنی آنکھ سے اسے دیکھا اور اس مؤلف کتاب سے بیان کیا۔ ۱۱۳۰ آدمی۔ اس وقت جان سے مارے گئے مجروحین کا حساب نہیں .... سب چھ سو مجروحین مفرور کو تہ تیغ کیا صرف ایک میر عباس کوتوال لشکر بہزار خرابی اپنے گھر پہونچے .... فوج سلطانی کے مجموع مقتول و مجروح ۱۲۵۰ آدمی .... جب انقلاب سلطنت ہوا ایک شخص نے دیوان حافظؒ سے تفاؤل کیا یہ شعر نکلا ؎

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را   چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کنید

اور رزیڈنٹ پیشتر ہی سے خبر دے چکے تھے کہ مولوی صاحب کو فساد سے منع نہ کیا تو سلطنت سے لی جائے گی۔ تاریخ قتل خود مولوی صاحب شہیدؒ۔ ؎

بذکر حق سراپا گوش دارم   ؎ حب علی در جوش دارم
شنو تاریخ من قبل از شہادت   سر میدان کفن بردوش دارم
۱۲۵ھ

تاریخی حیثیت سے اس واقعہ کے عقیدتمندانہ پہلو پر بحث کی ضرورت نہیں صرف اس کے متعلق اتنا ضرور کہنا ہے کہ اس کے اثرات روحانی کچھ بھی ہوں۔ مگر ظاہری صورت میں یہ واقعہ انتزاع سلطنت کا پیش خیمہ ہوا۔ واجد علی شاہ نے اپنے جواب میں اس الزام کو کہ اتنا سخت کشت و خون بدانتظامی کی بدولت ہوا۔ اس طرح پر رد کیا ہے کہ ہندو مسلم فسادات کے ایسے ہی واقعات انگریزی سلطنت میں ایک سال کے اندر بریلی، الہ آباد، اور بہت سی جگہوں پر رونما ہوئے اگر اودھ میں یہ صورت واقع ہوئی تو ایسی عجیب نہ تھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلم فسادات کی ابتدا شروع ہو گئی تھی۔ اگر اس واقعہ پر اچھی طرح سے غور کیا جائے تو اہالیان کمپنی کی کارگذاریاں صاف معلوم ہوتی ہیں قیصر التواریخ نے چند ظنی واقعات بیان کئے ہیں جن سے اس پہلو پر بھی کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔

"ایک دن اوٹرم صاحب شاہ تھجاہ کے پاس آئے مشروحاً بیان کیا کہ ہندوستان میں درمیان ہندو مسلمانوں کے فساد عظیم برپا ہوا چاہتا ہے ......

..... امر عجیب یہ ہے کہ اسی ہنگامہ میں ایک دن کپتان ہیئر صاحب نے صحت الدولہ متوسط شاہی سے کہا کہ اس فساد (واقعہ ہنومان گڈھی) کا جلد بندوبست کیا جائے کہ حتی المقدور طرفین سے خونریزی نہ ہونے پائے ورنہ سلطنت پر آفت آجائے گی چنانچہ بعد اس معرکہ کے جب صحت الدولہ کے پاس آئے کہا کہ تم ہمارا پیام بادشاہ اور وزیر سے جاکر کہہ دو اجل بر در شاہی رسید جب یہ تبلیغ رسالت کی فرمایا ہمیں دھمکاتے ہیں ...."

معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکوک عام تھے۔ بادشاہ اور وزیر تو عوام میں نشانہ ملامت بنے ہی تھے

مگر عام لوگ بھی یہ جانتے تھے کہ انگریزوں کی سازش ہے۔ متذکرہ بالا نظم میں جس کے ایک شعر کا مصرعہ ثانی اوپر نقل کیا گیا ہے انگریزی افسران فوج کے شمول کیطرف بھی اشارہ ہے سے

ہوا یارلو شمر اور تو یزید   امیر علی چوں حسین شہید

عوام اندرونی کوششوں کو تو کیا سمجھتے اور بادشاہ کی دقتوں کو کیسے محسوس کرتے انکی نگاہ میں تو سب سے زیادہ قصور وار دربار اودھ تھا چنانچہ بادشاہ کو غافل اور بیدین، اور وزیر کو ضلالت پناہ، اور اس سے بھی بدتر الفاظ سے اس نظم میں یاد کیا ہے۔

وہ غافل وہ بیدیں ترا بادشاہ   تو اس کا وزیر ضلالت پناہ

وزیرے چنیں شہریارے چناں   جہاں چوں نگیرد قرارے چناں

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ اودھ کی فرد جرائم میں یہ جرم باقی رہ جاتا لہذا اس کی تکمیل قطعی ضروری تھی۔ مگر عوام کو اس حقیقت کی کیا خبر ؂

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس افسانہ کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اسباب ضبطی سلطنت میں اس جرم کو بھی ایک اہم درجہ دیا جائے اور اس اہم سیاسی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے یہ ہنگامہ برپا ہو۔ جو تاریخی مواد اس وقت تک فراہم ہوا ہے اس کی مدد سے کم از کم یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس ہنگامے کے اسباب محض قدرتی نہ تھے۔ اور عوام میں اس قسم کی شورشیں اور ہندو مسلم فسادات موجودہ دور کیطرح سے شاہ اودھ کی قلمرو میں عام نہ تھے اس لئے کہ واجد علی شاہ کے الفاظ جو حسب ذیل درج کئے جاتے ہیں بہت صاف ہیں:۔

"الہ آباد میں ہندو مسلمان فساد ہوا اس میں سو آدمی مقتول ہوئے اور تمام قلمرو انگریزی میں کوئی ضلع باقی نہ رہا کہ جس میں محرم اور دسہرہ میں کشت و خون نہ ہوا ہو باوجودیکہ یہ فرقہ دونوں ہماری قلمرو میں کثرت سے ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا"

مگر ہمارے پاس کوئی بین ثبوت اس کا نہیں ہے کہ اسباب محض پیدا کردہ تھے اس لیے ہم اس مبحث پر پوری تنقید کرنا بہتر نہیں سمجھتے اور ناظرین کو قیصر التواریخ سے نقل کئے ہوئے اس واقعہ کو کہ ایک شخص نے دیوان حافظؒ سے تفاول کیا یہ شعر نکلا ؎

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را — چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

پھر یاد دلاتے ہیں۔ خواجہ حافظؒ کا یہ شعر تاریخی واقعات کی اس قدر صحیح رونمائی کرتا ہے کہ جی چاہتا ہے اس کا بار بار اعادہ کیا جائے۔ مولوی امیر علی شہیدؒ کا "خون ناحق" اور اس کے چار ہی مہینے بعد سلطنت کی ضبطی، بادشاہ کی معزولی اور علی نقی خاں کی وزارت کا خاتمہ یہ سب واقعات گویا کہ اس مصرعہ کے مصداق ہیں۔

چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

مگر یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ واجد علی شاہ جس مخمصہ میں پڑے تھے وہ معمولی نہ تھا۔ ایک طرف مولوی امیر علی شہید علیہ الرحمۃ کا ارادۂ جہاد اور تمام مسلمانوں کا جوش، دوسری طرف ہندوؤں کا ایک مسلمان بادشاہ سے رواداری کا مطالبہ تیسری طرف انگریزوں کا مولوی صاحب شہیدؒ کو باغی سلطنت طے کر دینا یہ سب گتھیاں ایسی نہ تھیں کہ آسانی سے سلجھائی جا سکتیں۔ بادشاہ اور وزیر دونوں خوب سمجھتے تھے کہ مولوی صاحب کی طرفداری کا کیا نتیجہ ہوگا اور تعصب کا کیسا سخت

الزام عائد کیا جائے گا اور ہند و رعایا کی برافروختگی و بیزاری اس کا نتیجہ ہوگی لہٰذا التوا کی کوشش کی گئی مگر "پروانہ" اپنے شدت طلب سے مجبور تھا۔ اس کو سیاسی ضروریات اور پابندیوں سے کیا غرض ظاہری اسباب یہ تھے کہ سلطنت کی ضبطی کا مسئلہ لندن میں ارباب حل و عقد کے سامنے زور شور سے درپیش تھا اور سلطنت اودھ کے انتزاع کا وقت آ گیا تھا، اور لارڈ ڈلہوزی عزرائیل کی صورت قبض روح کیلئے بالکل تیار تھے۔

۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۲ھ تاریخ اودھ کا سب سے نحس سال تھا۔ سو سوا سو برس کی پرانی سلطنت آن کی آن میں ختم ہو گئی۔ اگر پوچھا جائے کہ کس کا قصور تھا تو کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ واجد علی شاہ برسوں کی پرانی خرابیوں کے ذمہ دار نہ تھے اس سے قبل بھی برابر حکام انگریزی کو اودھ کی ابتر حالت کی شکایت رہی۔ لارڈ بنٹنک۔ لارڈ ہارڈنگ نے بھی بارہا آگاہ کیا اور اصلاح کی تجاویز بھیجیں جن پر کسی قدر عمل بھی ہوا لیکن جس طریقہ پر نظام حکومت بن گیا تھا اس کو تبدیل کرنا آسان نہ تھا۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں بھی انگریزوں کے ذہن میں ضبطی سلطنت یا اس سے ملتی جلتی تجاویز کا خیال موجود تھا۔ مفتی خلیل الدین خاں مرحوم کا کورو ی سفیر اودھ کے قلمی خطوط میں اس کی طرف مندرجہ ذیل اشارہ موجود ہے:۔

لہ ..... خدا بخیر کرد اند ارباب حل و عقد تجویز امرے بسقت میر نشد ہنوز منقح نشدہ کسے ازیں راز

لہ ..... خدا خیر کرے۔ حکام انگریزی کے خیال میں نہایت سخت تجاویز ہیں جن کا اس وقت تک اظہار نہیں ہوا ہے اور صیغہ راز میں ہیں۔ میں سرکار اودھ کا خیر خواہ ہوں جسکے سایہ میں عالم کی پرورش ہو رہی مگر میری آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہے۔ عجب نہیں کہ رفتہ رفتہ کوئی بات نکل آئے۔

واقعہ نیست مانیز خواہ آں سرکار م عالے بزیر سایہ کرمت آنجا پرورش می یابد مگر صدائے ما بہ نقار خانہ کہ می شنود عجب نیست کہ بتدریج رنگے دیگر گل کند......

زیادہ وضاحت کے ساتھ امپیریل اکارڈ آفس دہلی Imperial Records office کے مسودات سے پتہ لگتا ہے۔ گورنر جنرل کے سکریٹری میکناٹن صاحب کی ایک تحریر مورخہ ۶ مارچ ۱۸۳۷ء میں حسب ذیل عبارت سے ان تجاویز کا صاف پتہ چلتا ہے:۔

لہ

"In 1831, when it was apprehended that some great change might soon become necessary in our relations with Oude, various plans were discussed ...... one plan was that the King's authority should be set aside and that the whole of the Oude territory should be managed under the direct orders of the British govt. -----" (Bengal Political correspondence (secret) No 91 Dated March 6, 1837)

لہ ۱۸۳۱ء میں جبکہ یہ خیال تھا کہ اودھ اور کمپنی کے تعلقات میں کوئی اہم تبدیلی رونما ہوگی بہت سی تجاویز پیش ہوئیں جنہیں سے ایک تجویز یہ تھی کہ بادشاہ کو ہٹا کر پورا ملک انگریزی سلطنت کے زیر انتظام کر لیا جائے

مگر اس مہم کو سر کرنا معمولی کام نہ تھا اس لئے کہ انگریز مدبر ڈرتے تھے کہ مبادا اس کا نتیجہ رائے عامہ کا ہیجان اور شورش نہ ہو۔ چنانچہ متذکرہ بالا تحریر میں اس کی طرف صاف صاف اشارہ ہے:۔

"[1] .... Oude .... may be justly compared in one respect to a very useful safety valve in the great machine of our General Government where by many bad humours escape, which might otherwise become injurious to our selves" ----

اس لئے بارہا تجاویز ہوئیں اور پھر التوا ہو گیا۔ مگر لارڈ ڈلہوزی کا ایسا شخص بنی بنائی سلطنت کو ایک اشارہ چشم سے تباہ کر سکتا تھا۔ اصلاح کی صورتیں ہزاروں ہو سکتی تھیں مگر اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ کمپنی کو اب ضبطی سلطنت کے دیرینہ اثرات سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ تمام دیسی ریاستیں تباہ ہو چکی تھیں۔ پنجاب قبضہ میں آتے ہی اودھ کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے کہ انگریزی سلطنت کو اب کسی بڑی ہندوستانی طاقت سے تصادم کا اندیشہ نہ رہا اور اس لئے اودھ کی ضرورت بحیثیت سرحدی محافظ (Buffer state) کے باقی نہ رہی۔ ایسی صورت میں ضبطی سلطنت سے کمپنی کو نقصان کا اندیشہ نہ تھا بلکہ ایک زرخیز اور متمول ملک ہاتھ میں آتا تھا۔ مختصر یہ کہ

---

[1] .... اودھ .... ہماری ہندوستانی حکومت کی مشین کا ایسا پرزہ ہے جس کی بدولت ہم بہت سے آفات سے محفوظ رہتے ہیں ...."

انگریزوں کے مصالح ملکی اودھ کی سلطنت کو انگریزی راج کا حصہ بنانے کے موافق تھے اس وقت تک اودھ کی سلطنت سے جو کام لیا جاتا تھا اس کی اب ضرورت نہ تھی۔
ساتھ ہی ساتھ ظاہری وجہ یہ بھی تھی کہ اودھ کا انتظام سلطنت خراب تھا اور اس میں اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکی تھی اور نہ آیندہ اصلاح کی امید تھی لہذا رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے ضبطی ریاست ضروری سمجھی گئی۔ بہر صورت واجد علی شاہ کا کسی طرح سے قصور نہ تھا۔ ضبطی کی وجہ یا تو انگریزوں کے مصالح ملکی ہوئے یا وہ دیرینہ خرابیاں جو سعادت علی خاں کے بعد رونما ہوئیں اور جن کی اصلاح خود رزیڈنٹ اور گورنر جنرل نہ کر سکے۔ محض کاغذی تجاویز اصلاح پیش کرنا کافی نہ تھا۔ سر ہنری لارنس نے ان خرابیوں کی وجہ شاہان اودھ اور حکام سلطنت اودھ کی ناقابلیت نہیں بتائی ہے بلکہ صاف لکھدیا ہے کہ دوعملی حکومت یعنی رزیڈنٹ اور بادشاہ دونوں کی طاقتوں کا تصادم اور شاہان اودھ کے اختیارات کا تدریجی ازالہ سلطنت کی کمزوری اور تمام خرابیوں کا باعث ہوئی۔

قبل اس کے کہ اس موضوع پر بحث کی جائے اصل واقعہ کے متعلق واجد علیشاہ کی مشہور مثنوی "حزن آختر" سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

یہ واجد علی ابن امجد علی — سُناتا ہے اب داستاں رنج کی
کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے — جو طالع تھے بیدار سونے لگے
ہوا حکم جنرل گورنر بہ پیار — کرو سلطنت کو خلا ایک بار
جفاکش کا شاہ اودھ نام ہے — حکومت کا آخر یہ انجام ہے
جو وہ لاٹ ڈلہوزی اس وقت تھے — مضامیں انھوں نے یہ خفا میں لکھے

رعایا بہت تم سے ناراض ہے   تمھاری ریاست ہے بدنام شے
رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ   فقط نام کے تم رہو بادشاہ
مہینہ ہر اک ماہ اک لاکھ کا   ملے گا تمھیں کچھ نہیں شک ذرا
رزیڈنٹ جنرل اڈرم جو تھے   گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
ہوا گھر میں کہرام سُن کر یہ بات   وہ دن دوپہر ہوگئی ساری رات
وہ لائے تھے اسطرح کی ساتھ فوج   کہ جسطرح دریا کی آتی ہے موج
یہاں جز اطاعت نہ تھا دل میں شر   نہ تھی ایسے دن کی تو ہرگز خبر

....

بلا کر عزیزوں کو میں نے کہا   کہ رخصت میں ہوتا ہوں حافظ خدا

لکھنؤ سے سفر کا حال بنارس پہونچنا اور وہاں قیام کے بعد کلکتہ کی روانگی کا بھی اس مثنوی میں تذکرہ ہے۔ سہ

کیا بندے نے لکھنؤ سے سفر   لیا ساتھ تھوڑا سا کچھ ماحضر
رجب بھر رہے کانپور میں مقیم   برنڈن کے بنگلہ میں باخوف وبیم
دکھائی دیا ماہ شعبان کا جب   روانہ ہوئے واں سے باصد تعب
الہ جو آباد ہے ایک نام   رہے آٹھ دن اس میں اے خوشخرام
بنارس میں آکر رہے چودہ روز   وہ راجہ کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز
بہت پیش آیا اطاعت کیساتھ   اُتارا مجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ

....

وہاں پر دخانی کیا اک جہاز   چڑھے اُس پہ جس دم ہوئے سرفراز

....

دکھائی دیا جبکہ ماہِ صیام	تو کلکتہ میں آئے اے نیک نام

کلکتہ پہونچنے کے چند روز بعد غدر ہوا اور بادشاہ مٹیا برج سے کھو بیٹھے یعنی مٹیا برج سے فورٹ ولیم میں بحیثیت قیدی ہٹا دیئے گئے۔ اس درمیان میں جو مصائب پیش آئے ان کو اس طرح پر بیان کرتے ہیں۔

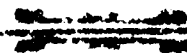
ہوئے بند در قید خانے کے جب	لکھوں کیا جو گذرا ستم اور غضب
کلیجہ مرا منھ کو آ آ گیا	رکا دم جو سینہ میں گھبرا گیا
زن و مرد تئیس تھے میرے ساتھ	انھیں لائے کوٹھی میں سب باندھ ہاتھ

غدر کی شورش رفع ہونے کے بعد بادشاہ کو اس قید فرنگ سے آزادی ملی پھر مٹیا برج میں قیام ہوا۔ واجد علی شاہ کی نفاست مزاج اور سلیم المذاقی نے اس بنگالی محلہ کو لکھنؤ بنا دیا تھا چنانچہ مولانا شررؔ مرحوم جنھوں نے بچپن میں اس پر فزا مقام کو دیکھا تھا لکھتے ہیں :-

"میں نے بادشاہ جمجاہ کو ان کے دربار کو، محلات عالیات کی رہنے کی شان کو شاہزادگان والاتبار کی دلچسپ صحبتوں کو، اور سواد بنگالہ میں لکھنؤ کے اُجڑے ہوئے گرد فر کو، اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ مٹیا برج مٹی میں مل گیا، کلکتہ کا وہ کونہ لارڈ ڈفرن کی بے مہری پر قربان ہو گیا، نہ اب وہ سر بفلک کوٹھیاں باقی ہیں، نہ وہ مینو سواد باغ و چمن، نہ وہ زندہ مخلوق کا عجائب خانہ نظر آتا ہے نہ وہ بہشت آئین مرغزار و رمنہ، نہ وہ محلوں کی ڈیوڑھیاں ہیں، نہ وہ شعراء اور ادباء کی نکھری صحبتیں، سب خواب و خیال ہو کر دامنِ فنا میں پہونچ گئیں مگر میری آنکھوں

کے سامنے آج بھی اُسی طرح بکھر رہی ہیں میں نے دنیا میں آنکھ کھول کر اس مشہور لکھنؤ کو تو نہیں دیکھا جو تہذیب کا مرکز، شائستگی کا منبع، اور علمی و ادبی برکتوں کا خزانہ بتایا جاتا ہے مگر مٹیا برج کو دیکھا ہے جو شمع اودھ کا آخری شمعدان اور دراصل اس زمانہ کا زندہ لکھنؤ تھا، لکھنؤ اجڑ گیا تھا مگر اس کے منتخب صاحبان کمال وہاں پہونچ کے ظل اللہ جہاں پناہ کے سایۂ عاطفت میں دریائے بھاگرتی کے کنارے بس گئے تھے۔ مٹیا برج نہ تھا بلکہ دربار مغلیہ دربار اودھ اور ہندوستان کے اسلامی تمدن کی آخری شمع بنگالہ کے ایک کونہ میں روشن ہوئی تھی اور چونکہ بجھنے کو تھی لہٰذا اکثر اوقات چراغ سحر کی طرح بھڑک بھڑک کر زیادہ نورانیت دکھا دیتی تھی۔"

واجد علی شاہ کی باقی عمر اسی کنج عزلت میں بسر ہوئی اور یہیں ۱۳۰۵ھ مطابق ـــــء میں انتقال کیا......؟



بابِ سوّم

واجد علی شاہ کی سیرت

مصنف تاریخ اودھ جو واجد علی شاہ کے معایب بیان کرنے میں نہایت دریدہ دہن ہیں لکھتے ہیں کہ یہ بادشاہ اس قدر رحم دل اور رقیق القلب تھا کہ باوجود اس قدر سلطنت اور زور وزر کے اس سن شباب میں کسی پر طیش اور بے رحمی نہیں کی نہ کسی موافق ومخالف کو ظلم سے ستایا نہ کسی کی جان لی غرور ونخوت جس سے ہزاروں میں بھی کوئی امیر خالی نہیں ہوتا نام کو نہ تھا۔ ۶

گر بدولت برسی مست نگردی مردی

مولانا شرر مرحوم جنھوں نے معزول شاہ اودھ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لکھتے ہیں۔

"واجد علی شاہ کی ذات میں اگلی اسلامی معاشرت کی اصلی تصویر نظر آتی تھی۔

جوانگریزیت کے غارت کرنے والے اثر سے بالکل معرّا تھی۔ اُن کی وضع و لباس اطوار و معاشرت اور مذاقِ سخن کو خدا نے موجودہ عالم کون و فساد کی خرابیوں سے بالکل محفوظ و مسئون رکھا تھا تہذیب تھی، دینداری تھی، قدر دانی تھی اور انتہا درجہ کی قناعت و خود فراموشی۔

واجد علی شاہ کی ذاتی خوبیوں، شرافت اور انسانیت کا ہر شخص قائل ہے ان کے عدل اور انصاف کے واقعات بھی مشہور ہیں۔ جس طرح سے انھوں نے بلاکشت و خون سلطنت انگریزوں کے ہاتھ میں دیدی وہ بھی نہایت قابل تعریف ہے علم وادب میں یہ بہت ہی بڑا پایہ رکھتے تھے۔ مولانا شرر مرحوم ان کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" واجد علی شاہ کا علمی مذاق نہایت ہی پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دراصل ان میں دو ہی ذوق تھے ایک ادب و شاعری کا اور دوسرا موسیقی کا اس کے سوا اور کسی چیز کا شوق ان میں نظر نہیں آتا ان کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی عربی کے عالم نہ تھے مگر فارسی میں ان کا درجہ شاید ابو الفضل سے کچھ ہی کم ہو گا .... دم بھر میں دو دو چار چار بند کی نثریں لکھ ڈالتے جو مشہور و نامور نثارانِ فارسی کے کمال کو یاد دلاتیں .... یہی حالت نظم کی تھی طبیعت اس قدر موزوں پائی تھی کہ شاید ایسا موزوں طبع نہ دیکھا گیا ہو ....

سیکڑوں مرثیے اور سلام کہہ ڈالے اور آتنی کتابیں نظم و نثر میں تصنیف کر دیں کہ ان کا شمار بھی آج کسی کو نہ معلوم ہو گا۔ اور ہر تصنیف میں شان برجستگی اور قلم برداشتگی تھی" مگر ان تمام صفات کے باوجود بادشاہت کے فرایض کی انجام دہی میں اُن سے

جو کوتاہی ہوئی اسے مؤرخ کو غیر جانبداری سے تسلیم کر لینا چاہیے مصنف تاریخ اودھ نے اُن کی عیش پرستی اور شباب کے واقعات کے متعلق ۲۰ صفحہ سے زیادہ لکھے ہیں۔ جن میں بہت سے مذاق سلیم سے گرے ہوئے ہیں اور قطعی قابل اعادہ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے اکثر تاریخی تحقیقات کا بار نہ برداشت کر سکیں گے اگر ہم ان میں سے ہر ایک کو محض لغو کہکر مسترد نہیں کر سکتے اور نہ اس حقیقت کو نظر انداز کر سکتے ہیں کہ واجد علی شاہ کو رقص و سرود اور عورتوں کی صحبت سے اس درجہ دلچسپی تھی کہ امور سلطنت کی طرف توجہ کا موقع کم مل سکتا تھا اسی سے وہ امور ملکی بڑی حد تک دوسروں کے ہاتھ سے سرانجام ہوتے اور دربار کا طریقہ بھی بدل دیا گیا۔ خواجہ سراؤں اور ڈھاڑیوں کی صحبت کا الزام بالکل بے بنیاد نہیں اور نہ اس کا جواب کہ کیا آصف الدولہ اور شجاع الدولہ کے زمانہ میں خواجہ سرا نہ تھے قابل اعتنا ہے۔ مولانا شرر مرحوم جو واجد علی شاہ کے بڑے مداح تھے اس حقیقت کو بغیر ظاہر کئے نہ رہ سکے کہ

"واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ عورتوں کے عشق میں دیوانے ہو رہے تھے اور بعض حسینوں سے اس درجہ محبت تھی کہ قید میں جب ان کے وصل سے محروم تھے تو ہر وقت انھیں یاد کیا کرتے اور بار بار یادگار محبت کی طور پر ان کی خاص خاص چیزیں مانگ بھیجا کرتے .... دلدار محل سے انکی مسی مانگی انھوں نے بھیجدی، اختر محل سے اُن کی زلفوں کے بال منگوالئے انھوں نے بھیجدیئے جن کو ہمیشہ سرہانے نظر کے سامنے رکھتے اور بار بار سونگھتے۔"

مثنوی حزن اختر میں واجد علی شاہ نے خود اس واقعہ کو نظم کیا ہے ؎

یہ اختر محل سے کہا اے قمر ذرا بھیجدے اپنے تو موئے سر

کہا جعفری سے کہ اے خوش جمال مجھے چاہئے تیرے منھ کا اُگال

محلات کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی چنانچہ اسی مثنوی میں ساٹھ ستر کی تعداد درج ہے۔

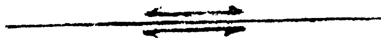
کروں ساٹھ ستر کی گر میں شمار تو ہو جائے پھر یک قلم آشکار
اب آئیں ہیں یہ پانچ چھ بیویاں جو کلکتہ میں ساتھ آئیں یہاں

مولانا شرر مرحوم نے اس کثرت ازدواج کے متعلق جو عذر پیش کیا ہے وہ زیادہ وقیع نہیں۔

"تمام مہ جبین اور ناز آفرین دلربائیں جو ان کی محل سرا میں تھیں عقد متعہ کے ذریعہ سے ان پر حلال کر لی گئی تھیں .... کوئی غیر ممتوعہ اور غیر منکوحہ عورت خدمت گذاری اور ذلیل خانگی کاموں کے لئے بھی حضوری تک نہ پہونچ سکتی تھی .... ان خادماؤں کو اگرچہ شرف ہم بستری نہ حاصل ہو سکتا مگر انھوں نے ممتوعات کی تعداد بڑھا رکھی تھی بہشتن تک نواب آبرسا بیگم تھی اور مہترانی نواب مصفیٰ بیگم۔"

اس میں شک نہیں کہ واجد علی شاہ نے حدود شریعہ سے تجاوز نہیں کیا مگر اس سے انگریزوں کا اعتراض کہ ان کو ہوس بازی، پریخانہ محلات اور محافل رقص و سرود سے فرصت نہ تھی کہ وہ امور ملکی کی طرف توجہ کرتے رفع نہیں ہوتا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ضبطی سلطنت اودھ محض واجد علی شاہ کی غفلت اور حسن پرستی کا نتیجہ نہ تھی اور کسی کی سیاسی قابلیت اس کو روک نہیں سکتی ممکن ہے کہ واجد علی شاہ کی عیش و عشرت اور غیر سیاسی مشغولیت نے

اُن کے فردِ جرم کو طویل بنا دیا ہو مگر اس سے سر ہنری لارنس کے ایسے منصف مزاج
انگریز بھی انکار نہیں کرتے کہ رزیڈنٹ کی امور ملکی میں دخل اندازی اور ذمہ دار
حکام انگریزی کا متواتر تغیر و تبدل سب سے بڑی وجہ ہوئی کہ انتظام سلطنت
بگڑتا گیا یہاں تک کہ لارڈ ڈلہوزی نے سلطنت کی ضبطی کو واحد طریقہ علاج
قرار دیا۔



باب چہارم

نظم مملکت اور سیاست

اودھ کا طریقۂ حکومت ایک عجیب مخلوط اور مرکب سیاسی نظام تھا جس میں سلطنت مغلیہ کے سیاسی اداروں کی جھلک ضرور تھی مگر ان کا نظم و نسق نہ تھا اس خامی کی سب سے بڑی وجہ اودھ کے دستور سیاسی کا ارتقا تھا چونکہ شروع سے اودھ کے فرمانروا اپنے کو سلطنت مغلیہ کا صوبہ دار سمجھتے تھے اس لئے یہاں کے دستور سیاسی کی تعمیر سلطنت مغلیہ کے نظام سیاسی کے ماڈل پر ہوئی جس میں عندالضرورت تبدیلیاں بھی ہوتی گئیں مگر آصف الدولہ کی تخت نشینی کے بعد جوں جوں انگریزوں کا دخل بڑھتا گیا اسی اعتبار سے انگریزی قوانین کے مطابق آئین حکومت میں بھی نئی اصطلاحات ہوئیں لیکن اول تو یہ تبدیلیاں صحیح جذبہ کے ماتحت عمل میں آئیں

اور دوسرے مشرقی اور مغربی اداروں کے بنیادی اختلافات نے جیسا کہ چاہئے تھا نظام سیاسی کے اجزا کو باہم مربتط نہ ہونے دیا۔ چنانچہ ایک بہت بڑا نقص اودھ کے سیاسی نظام کا یہ تھا کہ اس کے اکثر شعبے ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط نہیں رکھتے تھے۔ اسی سے ان میں تعاون اور اشتراک عمل ناممکن تھا۔

اس طرح کے سیاسی دستور وحدت اور مرکزیت نہیں رکھتے اور ان کا سب سے بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ مشین کے ڈھیلے پرزوں کی طرح اُن کی حرکت میں چستی نہیں ہوتی۔ ہر سیاسی دستور کے لئے وحدت اور ارتباط ضروری ہے مثلاً کوئی عدالت ایسی نہ ہو جو عدالت العالیہ کی ماتحت نہ ہو یا کوئی تعلیمی ادارہ ایسا نہ ہو جو سررشتہ تعلیم سے الگ ہو۔ مگر یہ مرکزیت اودھ کے سیاسی نظام میں مفقود تھی اکثر شعبے اور سیاسی ادارے ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور جب ضرورت ہوتی یا موقع ملتا تو ذاتی اثرات کے ذریعہ سے مرکزی حکومت سے بلاواسطہ منسلک ہو جاتے تھے۔ جدید اصول حکومت اس طریقہ کو ناپسندیدہ سمجھتا ہے اور ہر دستور سیاسی کے لئے یہ ضروری مانا جاتا ہے کہ تمام حکام اپنے افسران بالادست کے توسل سے حاکم اعلیٰ یا بادشاہ تک پہونچیں نہ کہ بلاواسطہ یا شخصی اثرات کے ذریعہ سے۔

اس مختصر بحث کے بعد اودھ کے سیاسی نظام کی تشریح اور ہر ایک پر مختصراً تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جن شعبوں میں اس کی تقسیم کی جاسکتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ بادشاہ اور اُس کا سیاسی اقتدار۔

۲۔ وزیر اعظم، بادشاہ، رزیڈنٹ اور گورنر جنرل سے اس کے تعلقات۔
۳۔ رزیڈنٹ۔
۴۔ محکمہ مال اور مالیات کا نظم و نسق۔
۵۔ ریاست کی صوبجاتی تقسیم اور صوبوں کا نظام حکومت۔
۶۔ فوج۔
۷۔ پولیس، کوتوالی اور دیگر محکمہ جات۔

۱۔ بادشاہ بادشاہ مطلق العنان تھا گو کہ کمپنی کی حکومت کے اثرات اس درجہ وسیع تھے کہ سلطنت اودھ کی خارجی حکمت عملی بالکل انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کا اندرونی انتظام ضرور بادشاہ کے ہاتھ میں تھا مگر پھر بھی عہد معاصر سے متاثر دیسی حکومتوں کی طرح اودھ میں بھی ریزیڈنٹ کے اختیارات۔ اندرونی حکمت عملی میں بھی اس درجہ بڑھے ہوئے تھے کہ بقول ایک یوروپین سیاح کے کہ شاہ اودھ اگر کسی عورت سے شادی بھی کرنا چاہتے تو وہ بغیر ریزیڈنٹ کی مرضی کے نہیں کرسکتے، ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں بشرطیکہ ریزیڈنٹ اس میں مداخلت کرنا چاہے عملی طور پر خواہ اس کو معاہدے کی بنا پر اجازت نہ بھی حاصل ہوتی دخل کر سکتا تھا اس کے علاوہ جہاں تک حکام ماتحت اور عملے کا تعلق تھا یا جن چیزوں میں انگریز مداخلت نہیں کرنا چاہتے تھے اُن میں بادشاہ کی طاقت قطعی مطلق العنان تھی اصولاً شاہی حکم میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا تھا نہ تو کوئی مجلس شوریٰ تھی اور نہ کوئی رعایا کی نمائندہ مجلس یہ ضرور ہے کہ رائے عامہ کے اثرات پڑتے تھے اور کچھ مقتدر ہستیاں وقتاً فوقتاً ایسی بھی تھیں جن کا لحاظ شاہی استبداد دیت۔

بھی کرنے پر مجبور تھی مثلاً سعادت علی خاں کے زمانے میں بہو بیگم، نصیر الدین حیدر کے زمانے میں بادشاہ بیگم اور واجد علی شاہ کے زمانے میں اُن کی ماں ملکہ کشور، مگر مجموعی حیثیت سے پھر بھی بادشاہ کی طاقت مطلق العنان ہی تھی۔

۲۔ وزیر اعظم | یہ عہدہ بادشاہ کے حسب منشا اُن کے کسی خاص معتمد یا کسی خاص تجربہ کار شخص کو عطا ہوتا تھا مثلاً نصیر الدین حیدر کے زمانے میں معتمد الدولہ معروف بہ آغا میر کو بادشاہ نے محض اپنا خاص معتمد سمجھ کر نائب سلطنت یعنی وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں میر فضل علی اُن کے استاد کو اعتماد الدولہ کا خطاب دے کر وزیر اعظم بنایا گیا۔ اسی طرح سے واجد علی شاہ کے زمانے میں علی نقی خاں کو جو بادشاہ کے سسر تھے یہ عہدہ عطا ہوا۔ وزیر اعظم کو علاوہ بادشاہ کے ریزیڈنٹ اور بواسطہ گورنر جنرل سے بھی تعلق رہتا تھا جس زمانے میں بادشاہ امور سلطنت سے کم دلچسپی لیتے تھے اس وقت وزیر اعظم تمام امور سلطنت پر حاوی ہوتے تھے۔ منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں جو نصیر الدین حیدر کے زمانے میں دو سال تک وزیر رہے سلطنت کے جزو کل تمام معاملات پر اس درجہ چھائے ہوئے تھے آخر کار خود بادشاہ کو یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ وزیر خود مختار اور مالک سلطنت بننا چاہتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ بادشاہ اور ریزیڈنٹ کی ناچاقی وزیر کے سر آجاتی تھی نہ تو وہ بادشاہ کو ناخوش کر سکتا تھا اس لئے کہ اُس کا عزل و نصب دونوں اسی کے ہاتھ میں تھے اور نہ ریزیڈنٹ کو اس لئے کہ دراصل یہ چیز مسلّم ہو گئی تھی کہ نائب سلطنت ایسا شخص ہو جو حکومت انگریزی کا خیر خواہ بھی ہو مگر یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ بمشکل چل پاتی تھیں اس لئے کہ بادشاہ وزیر سے

یہ امید رکھتے تھے کہ وہ اُن کی جانب داری کرے گر ریزیڈنٹ کا اثر اس درجہ قوی تھا کہ وزیر کو ہر وقت اس کا ڈر بھی رہتا تھا کہ اگر ریزیڈنٹ کے حسب منشا نہ ہوا تو اُس کی وزارت کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا اس لئے کہ بادشاہ خود ریزیڈنٹ کے تابع فرمان تھے اور اُن کے ادنیٰ اشارہ چشم پر کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچا دینے کے لئے مجبور تھے ۱۸۲۵ء کے بعد سے خاص طور پر بادشاہ کی طاقت ریزیڈنٹ کے مقابلے میں گھٹتی ہی چلی گئی اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ وزیر کو ریزیڈنٹ کو خوش رکھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی اکثر تو یہ ہوتا تھا کہ بادشاہ وزیر سے صرف اس بنا پر خفا ہو جاتے تھے کہ وہ ریزیڈنٹ سے ساز باز رکھتا ہے اور اسی شخص کو جسے وہ اپنا معتمد خاص سمجھ کر وزیر بناتے تھے چند دنوں بعد اپنا دشمن سمجھکر برخواست کر دیتے تھے، تاریخ اودھ کے صفحات ایسے واقعات سے رنگین ہیں جن میں وزرا سلطنت ہر دوسرے تیسرے برس ایسے ہی الزامات پر برخواست ہوئے ہیں اور اکثروں نے جیسے معتمد الدولہ آغا میر یا منظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نے حکومت انگریزی کو اپنا محافظ بنا کر شاہان اودھ کے اختیارات کو سخت صدمہ پہنچایا۔

۳۔ ریزیڈنٹ دیسی ریاستوں میں ریزیڈنٹ عجیب و غریب حیثیت رکھتا تھا وہ طریق معاونت یا Subsidiary System کا سب سے سخت حربہ تھا جو ہندوستانی ریاستوں کی طاقت کے کچلنے کے لئے رکھا گیا تھا، اودھ اور کمپنی کے تعلقات کی تاریخ میں ریزیڈنٹ اور ریاست کے تعلقات مختلف وقتوں میں مختلف صورتیں اختیار کرتے رہے تھے۔ اودھ

کے زمانہ سے ایک انگریزی افسر دونوں حکومتوں کے درمیان تعلقات خوشگوار
رکھنے کے لئے اور کمپنی کے مفاد کے واسطے اودھ میں رہنے لگا تھا آصف الدولہ
کے زمانے میں اس کے اختیارات بہت بڑھ گئے سعادت علی خاں کے دور میں
اور بھی زیادہ یہاں تک کہ کرنل بیلی اور اسکاٹ اور سعادت علی خاں کے درمیان
جو خط وکتابت ہوئی اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ گورنر جنرل ریزیڈنٹ کو لکھنؤ
میں نواب اودھ کی آزادی اور طاقت کو ختم کرنے کے لئے رکھتے تھے دراصل اندرونی
معاملات میں بھی ریزیڈنٹ کو اس درجہ اختیار حاصل تھا اکثر تو ریزیڈنٹ کا دربار
الگ لگتا تھا جس میں وہ تمام لوگ حاضر ہوتے تھے جن کو نواب سے جائز یا ناجائز
شکایتیں ہوتی تھیں گویا نواب کی حکومت کے مقابل ایک دوسری طاقت خود
دار السلطنت میں ایسی موجود تھی کہ جو اس کے مخالفین کو ہر طرح کی مدد دینے کے لئے
تیار اور اس کی آزادی کو ہر طرح محدود کرنے کے لئے کمربستہ تھی۔ ریزیڈنٹ کی
استبدادیت کی شکایتوں سے نواب اودھ اور گورنر جنرل کے درمیان کی خط وکتابت
بھری ہوئی ہے یہ ضرور ہے کہ وقتاً فوقتاً گورنر جنرل یا ریزیڈنٹ کے انفرادی رجحانات
کے اثر سے اس استبدادیت میں کمی یا زیادتی ہو جاتی تھی مگر عام طور پر یہ رائے
صحیح ہے کہ شاہ اودھ بغیر ریزیڈنٹ کی اجازت کے ایک عورت کو بھی اپنے محل
میں داخل نہیں کر سکتے جیسا کہ ایک یوروپین سیاح منڈی نے بیان کیا ہے۔ ریزیڈنٹ
کے اثرات اس قدر مختلف حکومتوں کے شعبوں پر مستولی تھے کہ ریاست کے ہر بڑے
اور چھوٹے عہدیدار کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ ریزیڈنٹ کو خوش
رکھے ریزیڈنسی کا عملہ علی الخصوص میر منشی کی نگاہ کرم کے امیدوار بڑے اور چھوٹے

سبھی تھے یہی وجہ تھی کہ ریزیڈنسی میں لاکھوں کے وارے نیارے ہوا کرتے تھے ریزیڈنسی کا ایک معمولی سپاہی بھی اتنا کماتا تھا جتنا کہ ایک معزز ریاست کا عہدہ دار رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر اکثر ریزیڈنسی ہی کے سپاہی متعین تھے جس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ شاہ اودھ یا وزیر کی بیجا کارروائیوں سے اُن لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کی جائے اور یہ معمولی سپاہی بعض موقعوں پر سو سو روپیے ماہوار سے زائد کی رقمیں محض اس خدمت کی عوض میں پاتے تھے ریزیڈنسی کا عملہ علاوہ اپنی جائز تنخواہوں کے تمام روسائے سلطنت اور حکام سے ماہانہ یا سالانہ نذریں وصول کرتا تھا، بہت سے لوگ ریزیڈنسی کے احاطہ کا چکر صرف اسی لئے کیا کرتے تھے کہ بڑے صاحب کی حضوری نصیب ہو جائے، اور اگر خوش قسمتی سے اُن کی امید بر آئی اور وہ صاحب بہادر کی خوشنودی حاصل کر سکے تب لوگ اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور بڑی سی بڑی مہمیں اُن کے توسل سے سر ہوتی تھیں۔

"I was introduced to the Great Sahib! — a man whom perhaps, you would jostle in London, as if he were only an ordinary mortal, and yet who excercised a more unlimited sway over a King and Count and five millions of people than any sovereign in Europe
(Knighton — An Eastern King)

ریزیڈنٹ کے معمولی اختیارات بھی اس درجہ وسیع تھے کہ سلطنت کی بڑی سی بڑی دقتوں کی وہ اکثر وجہ ہوتے تھے اور بعض بدانتظامیاں تو مستقلاً انھیں اسباب کا نتیجہ تھیں مثلاً یہ ایک عام رواج تھا کہ ریزیڈنٹ کے دربار میں (Guaranteed English subjects) یعنی اودھ کے وہ باشندے جو وثیقہ دار یا وظیفہ خوار سرکار انگریزی تھے ان کے وکلا یا وہ خود حاضر ہوتے تھے اور وہ نواب کی حکومت کے متعلق ریزیڈنٹ کے توسل سے اپنے تمام مراحل طے کیا کرتے تھے اکثر ایسے معاملات سے ریاست کو نہایت درجہ نقصان پہونچتا تھا مثال کے طور پر معتمد الدولہ اور نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے جھگڑے جن میں باوجود بادشاہ کی انتہائی مخالفت کے ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل نے برخواست شدہ وزیر معتمد الدولہ کو معہ اپنی مسروقہ دولت کے اودھ سے انگریزی چوکی اور پہرہ کی حفاظت میں ملک انگریزی تک پہونچا دیا واقعہ اس طرح پر ہوا کہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ نے اپنے وزیر معتمد الدولہ کو برخواست کیا اور یہ الزام لگایا کہ انھوں نے سلطنت کے محاصل سے بہت ناجائز فائدے اٹھائے اور کروڑ روپیہ کی دولت جمع کر لی دو برس تک معتمد الدولہ کو لکھنؤ میں حساب فہمی کے لئے روک رکھا گیا مگر آخر کار اُن کی انگریزوں کے ساتھ یگانگت خوش اخلاقی اور بیش قیمت تحائف نے اُن کی گلو خلاصی کرائی اور وہ اپنی تمام کثیر دولت کے ساتھ جس کا اندازہ ہمعصر سیاح کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے کہ باربرداری کی گاڑیاں اور چھکڑوں کی قطار اتنی لمبی تھی کہ اس کا ایک سرا لکھنؤ اور دوسرا کانپور تک پہونچتا تھا، انگریزی فوج کی حفاظت میں

بغیر بال بیکا ہوئے انگریزی ملک میں پہونچ گئے اس جانب واری کی وجہ اصولاً صرف یہی تھی کہ معتمد الدولہ سلطنت انگریزی کے وثیقہ دار تھے اور اس حیثیت سے اُن کی جان و مال کی حفاظت سلطنت انگریزی پر فرض تھی۔

اس قسم کے بہت سے ناجائز دباؤ کے واقعات موجود ہیں اودھ کے چھوٹے طبقہ کے لوگ اس زمانہ میں بہت سے انگریزی فوج میں سپاہیوں میں نوکر تھے جن میں سے اکثر ہر سال اپنے گھر واپس آنا چاہتے تھے چونکہ انکو چھٹیاں ملنا مشکل ہوتی تھیں لہٰذا وہ اکثر اپنے کمانڈنگ افسر کے پاس یہ عذر لیکر پہونچتے تھے کہ ہماری جائداد پر ہماری غیر موجودگی میں قریب کے زمینداروں نے بجبر قبضہ کرلیا ہے اس لئے ہم کو اس کے تحفظ کے لئے وطن جانا ہے چھٹی ملنے کے ساتھ ساتھ ان کو ایک نفع یہ بھی ہوتا تھا کہ افسر کمانڈنگ ایک خط رزیڈنٹ کے نام دے دیتا تھا کہ اس شخص کی جائداد لوگوں نے بجبر لے لی ہے اس کے مقدمہ میں تاخیر نہ کی جائے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یہ خط لے کر گھر پہونچتا تھا اور مہینوں اپنے گھر پر مزہ میں رہتا تھا اور جب چھٹی ختم ہونے کو آتی تو توسیع کے لئے اس بہانہ سے کہ اس وقت تک حکومت کے افسروں نے اس کے مقدمہ میں کوئی کارروائی نہیں کی پھر درخواست بھیجدیتا تھا جس کی منظوری کے ساتھ ساتھ افسر کمانڈنگ پھر رزیڈنٹ کو اس کے فیصلہ کے لئے یاددہانی کردیتا تھا اب یہاں یہ قصہ تھا کہ نہ کوئی جائداد تھی اور نہ کسی نے اس پر بجبر قبضہ کیا تھا ادھر افسر کمانڈنگ کا خط پہونچا اور رزیڈنٹ نے عمال شاہی کو اپنی تحریر کے ساتھ منسلک کرکے کارروائی کے لئے روانہ کیا، مفروضہ جائداد جو اکثر کسی غریب پڑوسی زمیندار

کی ملک ہوتی تھی سپاہی کے قبضہ میں محض اس ڈر میں پہونچ جاتی تھی کہ (بڑے صاحب) ریزیڈنٹ صاحب کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور اس کا الزام نہ ہو کہ سلطنت کے عمال نے انگریزی ملازمین کے حقوق کی پرواہ نہیں کی اس طرح کے اکثر مقدمات کا تذکرہ دہلی کے (Imperial Records office) کے کاغذات میں موجود ہے نہ صرف اس قدر بلکہ (Col Sleeman) نے اپنی مشہور تصنیف (A Journey through the Kingdom of Oudh) میں اس کا بالتفصیل ذکر کرکے اس کے دور کرنے کی سفارش کی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ریزیڈنٹ کی طاقت اودھ میں بادشاہ اور وزیر کی طاقتوں سے کسی طرح کم نہیں تھی بلکہ ان دونوں کو اس کا بعض چیزوں میں دست نگر رہنا پڑتا تھا یہی وجہ ہے کہ اودھ کو کسی طرح خود مختار سلطنت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ل اگر ریزیڈنٹ جلد باز اور تیز مزاج آدمی ہوا تو بادشاہ دربار و حکام ضلع کو دھمکا کر عجلت کے ساتھ ایسے استغاثوں کا فیصلہ کراتا ہے جس سے دوسروں کے استحقاق زائل ہو کر افسروں اور سپاہیوں کا فائدہ ہوتا ہے اور جو کہیں ریزیڈنٹ زیادہ ایماندار نہ ہوا تو صاف حکم دیدیتا ہے کہ نئے متدعویہ سپاہی کو دلا دیجائے .... یہ استحقاق ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں گویا ایذا رسانی کا ایک ہتھیار ہے اور اس ہتھیار کو ہر روز اودھ کے دربار پر چلاتا ہے اور جیسا موقع دیکھتا ہے یا جیسا اس کا مزاج ہوتا ہے یا جیسے افسروں اور سپاہیوں سے سابقہ پڑتا ہے ویسی ہی سختی یا نرمی کرتا ہے۔ (شام اودھ ترجمہ سلیمن جرنی)

۴۔ محکمہ مال و مالیات اس محکمہ کا اعلیٰ حاکم دیوان کہلاتا تھا اور بالعموم ہندو ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے متعلق یہ عام خیال تھا کہ وہ روپیہ پیسہ اور حساب کے معاملات میں اس قدر تجربہ کار اور کاردان نہیں ہوتے جیسے ہندو اور علی الخصوص کایستھ۔ وزیر اعظم کو چھوڑ کر یہ سب سے زیادہ معتمد اور صاحب اقتدار ارکان حکومت میں سے تھا۔ یہ بلا واسطہ بادشاہ سے امور مالی اور ملکی میں تعلق رکھتا تھا۔ اکثر بادشاہ چونکہ ان امور سے بالکل ناواقف ہوتے تھے لہذا وزیر اعظم کے ایما اور مشورہ سے دیوان کو اپنے محکمہ کے انتظامات کرنا پڑتے تھے۔ مداخل اور مخارج کل اس کے ہاتھ میں تھے۔ صوبجاتی حکومتوں سے جو رقمیں وصول ہوتی تھیں اور جن مدات میں صرف ہوتی تھیں اس کے دفتر میں درج ہوتی تھیں اور اسی کی تحویل میں رہتی تھیں۔

نواب سعادت علی خاں کے زمانے سے ایک مخصوص محکمہ جس میں خفیہ طور پر مسکوک وغیر مسکوک زر اور جواہرات وغیرہ جمع کئے گئے تھے علیحدہ کپتان فتح علی خاں کے مکمل چارج میں بنایا گیا تھا۔ اس خزانہ کا حساب ریاست کے خزانوں اور ان رقوم سے جو شاہی محلات میں جمع تھیں الگ تھا اور ایک "بہی" خود نواب سعادت علی خاں کے پاس رہتی جس سے اس خزانہ کی کل مالیت اور رقوم کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ خزانہ رفتہ رفتہ نواب سعادت علی خاں کے بعد خرچ ہوتا گیا۔ بہت کچھ نواب غازی الدین حیدر نے اس سے لے کر سرکار انگریزی کو قرض دیا۔

۵۔ صوبجاتی تقسیم اور صوبوں کی حکومت سلطنت صوبوں میں تقسیم تھی اور ہر صوبہ میں

ایک عامل مقرر تھا جس کو ناظم یا چکلہ دار کہتے تھے یہ کبھی تو مستاجر ہوتا تھا یعنی اس کو ٹھیکہ پر ملک کا ایک حصہ دیدیا جاتا تھا اور تمام عملہ اس کا ذاتی ہوتا تھا اس کو کوئی حساب نہیں دینا پڑتا تھا سوا اس کے کہ وہ رقم معینہ کو ادا کر دیتا تھا اور کبھی امانت کے اصول پر اس کو معینہ تنخواہ سرکاری خزانہ سے ملتی تھی اور یہ صرف وہ رقم شاہی خزانہ میں داخل کرتا تھا جو در اصل وصول ہوتی تھی یہ شاہی تنخواہ دار ہوتا تھا نہ کہ ٹھیکہ دار مگر دونوں صورتوں میں اس کو پولیس، عدالت اور دوسرے اختیارات حاصل ہوتے تھے صوبہ پرگنوں میں تقسیم تھا اور ہر پرگنہ میں ایک تحصیلدار مقرر تھا جس کی حیثیت پرگنہ میں وہی ہوتی تھی جو صوبہ میں ناظم یا چکلہ دار کی، ہر پرگنہ اور چکلہ میں ایک دیوان بھی ہوتا تھا جو مال کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا تھا ہر پرگنہ میں قانون گو اور چودھری جو سلطنت مغلیہ کے زمانے سے چلے آرہے تھے وہاں کے مقامی حکام ہوتے تھے، چودھری عام طور پر مسلمان اور قانون گو ہندو ہوتا تھا چند خاندان مخصوص تھے جن سے قانون گو اور چودھری ہوتے تھے ان کے پاس پرگنہ کے تمام کاغذات قابل کاشت زمین کی تفصیلات، مالگذاری کی معافیاں اور دیگر ضروری اطلاعات کے کاغذات موجود رہتے تھے، اُن کی خود کی شاہی معافیاں تھیں اس لئے ان کو کوئی تنخواہ شاہی خزانہ سے نہیں ملتی تھی جب کوئی ناظم یا چکلہ دار نیا آتا تھا یا سال کے اُس حصہ میں جب زمینداروں اور تعلقداروں پر تشخیص لگان ہوتی تھی یہ اپنے کاغذات کے ساتھ ناظم کی کچہری میں حاضر ہوتے تھے، اسی طرح پر قاضی اور مفتی مقدمات کے فیصلہ کے لئے مقامی حکام تھے مفتیوں کا عہدہ سعادت علی خاں کے زمانہ سے توڑ دیا گیا تھا اور اسکی جگہ پر عدالتیں قائم

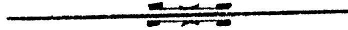
ہو گئی تھیں مگر پھر بھی کہیں کہیں پر مقدمات کے فیصلہ کے لئے مفتی بھی موجود تھے قاضی جج کی حیثیت رکھتا تھا اور مفتی اصول شرع یا رواج کا ماہر ہوتا تھا۔ مسلمان مستغیثوں کا فیصلہ باصول شرع ہوتا تھا گو کہ رواج کو بھی ان میں دخل تھا اور غیر مسلموں کا ان کے اصول مذہب اور رواج کے مطابق ہوتا تھا۔

۶۔ فوج بکسر کی لڑائی کے بعد شجاع الدولہ کی فوج الہ آباد کے معاہدے ۱۷۶۵ء کے ماتحت کم کر دی گئی تھی اس کے بعد سے رفتہ رفتہ فوج میں تخفیف ہوتی گئی ۱۸۰۲ء میں جب سعادت علی خاں اور لارڈ ولزلی کے درمیان نیا عہدنامہ ہوا اور آدھا ملک سرکار کمپنی کو دینا پڑا اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ نواب اودھ کوئی فوج سوا انگریزی فوج کے نہ رکھے گا اُس وقت سے دراصل ریاست میں کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی یہ ضرور تھا کہ اس معاہدے کے بعد بھی نواب اودھ ریاست کی معمولی ضرورتوں کے لئے سپاہی رکھتے تھے جن کے پاس توپیں بھی تھیں اور بندوقیں بھی مگر اُن کی ترتیب اور تنظیم باقاعدہ فوج سے کہیں کم درجہ کی تھی اور اُن سے جو کام لیا جاتا تھا وہ صرف یہ تھا کہ وہ یا تو باغی زمینداروں کے کچے قلعوں کو مسمار کریں اور اُن کو ریاست کے محاصل ادا کرنے پر مجبور کریں یا بڑے شہروں میں میلوں اور دوسرے ہجوم کے مواقع پر پولیس کے فرائض ادا کریں مگر اس غیر منظم فوج کا رکھنا بھی انگریزوں کی نگاہ میں برابر کھٹکتا رہا اور ہر زمانہ میں اس کی امکانی کوشش کی گئی کہ اودھ میں کسی قسم کی کوئی فوجی تنظیم باقی نہ رہے یہ بھی عہدمعادنت کا بڑا اصول تھا کہ دیسی ریاستوں کی فوجی طاقت بالکل ختم کر دی جائے تاکہ وہ بے دست و پا ہو جائیں جب کبھی اودھ کے کسی نواب نے ذرا بھی فوجی تنظیم کی طرف توجہ کی یا

اس کے تیوروں سے خود مختاری کا دعویٰ بھی اظہار ہوا فوراً ریزیڈنٹ اور گورنر جنرل نے اُس کی سرکوبی ضروری کی۔ مثال کے طور پر وزیر علیخاں آصف الدولہ کے جانشین کا واقعہ ہے جن کی چند ماہ کے بعد معزولی کی یہی وجہ ہوئی کہ انگریزوں نے ان کو اس درجہ اپنا مطیع فرمان نہیں پایا جس حد تک کہ وہ نواب اودھ سے امید کرتے تھے۔

۷۔ پولیس اور دیگر محکمہ جات بڑے شہروں میں پولیس کے انتظام کے لئے ایک کوتوال شہر ہوتا تھا جیسے لکھنؤ میں مسیتا بیگ جو انتزاع سلطنت کے بعد بھی کوتوال شہر رہے، کوتوالی کے متعلق نہ صرف مجرموں کا پکڑنا ہوتا تھا بلکہ ساتھ ہی ساتھ کوتوال کو مجسٹریٹ کے اختیارات بھی ہوتے تھے وہ شہر کے جھگڑوں اور فوجداری کے مقدمات کا فیصلہ بھی کرتا تھا بیع وشرع کے معاملات میں بھی جو قصے قضیے ہوجاتے تھے اُن کو بھی طے کرتا تھا، انگریزی زمانہ کے کوتوال شہر سے کہیں زیادہ اس کے اختیارات تھے اور لکھنؤ کا کوتوال شہر تو خاص ارکین سلطنت میں سے سمجھا جاتا تھا۔ شہروں کے علاوہ پولیس کا انتظام علی العموم زمینداروں اور گاؤں والوں کے تعاون پر مبنی تھا چوکیدار ہر جگہ مقرر تھے اور ہر زمیندار چوکیدار کو معافی دیتا تھا۔ زمینداروں اور رعایا کے تمدنی فرائض میں یہ چیز داخل تھی کہ وہ پولیس کے انتظام میں مدد دیں، ڈاکوؤں اور چوروں کو گرفتار کرائیں جس کا مال چوری جائے اُس کی تفتیش میں پوری کوشش کریں۔ ایک افسر تھانہ دار کے نام سے بھی متعین ہوتا تھا جس کے فرائض نہ صرف پولیس کے تھے بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ مال کے محکمہ کے بھی کام کو انجام دیتا تھا لیکن یہ عہدہ دار آج کل کے تھانہ دار سے بالکل الگ تھے اور تھانہ کے معنی بھی پولیس کی چوکی نہ تھی جیسے

آج کل گاؤں میں تھانہ کے نام سے ایک ایسا مکان مختص ہوتا ہے جہاں زمیندار تحصیل وصول کے وقت ٹھہرتے ہیں یا اگر کوئی سرکاری افسر اتفاقیہ پہونچ گیا تو وہ قیام کرتا ہے غالباً اسی طور پر نوابی میں بھی تھانے ہر بڑے گاؤں میں موجود تھے جن کو پولیس کی چوکی کہنا غلط ہے۔



باب پنجم

سماجی حالت اور دیگر کوائف

ہندوستان کی تاریخ کی یہ سب سے بڑی کمی ہے کہ سماجی حالات کی طرف ہمعصر مؤرخین بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ اس لئے بادشاہوں اور امراء کی سوانح نگاری تاریخ کا بہت بڑا جزو بن گئی ہے۔ بہر صورت اس کمی کا لحاظ کرتے ہوئے اس عہد کے جس قدر سماجی حالات تاریخی جستجو سے دریافت ہو سکے ہیں قلمبند کئے جاتے ہیں۔

مذہب

ہندو مسلمان دونوں مذاہب کی تعداد آبادی میں پورے طور پر بتانا مشکل ہے مگر یہ امر مسلم ہے کہ اول الذکر کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مگر آج کا سا مذہبی تعصب

بالکل نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندو مسلمان شیر و شکر تھے۔ دونوں کے تیوہار کسی حد تک مشترک ہو گئے تھے۔ اکثر مذہبی لوگ جن کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔ ضرور دوسری قوم کے تیوہاروں میں شرکت سے اجتناب کرتے تھے۔ مگر بقیہ عوام ایک دوسرے کے بالکل شریک تھے۔ ہندو میلوں میں مسلمان اور مسلمان عرسوں میں ہندو بکثرت جاتے تھے۔ مسلمان صوفیوں اور ہندو فقیروں سے اعتقاد بلا تفریق مذہب ہندو اور مسلمان دونوں کو تھا۔ اور ان کی خلوت گاہیں اور کٹیاں ایسے مشترکہ عقیدت گاہیں بن گئی تھیں جن کو قومی معبد کہنا زیادہ غلط نہیں ہوگا۔ بعض کا عقیدہ تھا کہ اصل مذہب خدا پرستی ہے۔ جس میں مذاہب کا اختلاف اور تعصب اصل مقصد سے دور رہتا ہے۔ بعض ہندو مسلمان فقیروں سے اس درجہ عقیدت رکھتے تھے کہ اُن کے مرید ہو جاتے تھے اور شرائط مریدی جس میں اسلامی اصول کے اوراد و وظائف کا بھی ورد تھا بجا لاتے تھے مثلاً مہاراجہ ٹکیٹ رائے دیوان نواب آصف الدولہ حضرت شاہ باسط علی قلندر الہ آبادی اور اُن کے خلیفہ شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی سے کمال عقیدت مندی رکھتے تھے۔ اور ارادت و خلوص کی ہر شرط کو پورا کرتے تھے۔ اُن کی بے تعصبی اور سچی عقیدت مندی کی مثال اس وقت تک موجود ہے، کاکوری (لکھنؤ) میں ایک عالیشان مسجد اُن کی تعمیر کردہ اس وقت بھی بے مرمت کھڑی ہے۔

مسلمانوں کی آبادی کے دو بڑے جز (سنی و شیعہ) تھے۔ سلطنت شیعہ تھی دونوں فرقوں میں مذہبی اختلافات کم نہ تھے۔ سلطنت اودھ کے زمانہ میں لکھنؤ میں شیعیت کا ایک مرکز قائم ہو گیا جس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ آصف الدولہ کے

زمانے سے لکھنؤ میں شیعہ آبادی بڑھنا شروع ہوئی اسی سے قبل چونکہ فیض آباد دارالسلطنت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے وہاں دربار کے متوسلین اور امراء جنمیں بعض مذہبًا شیعہ تھے مقیم تھے۔ جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو مرکزی حیثیت دیکر وہاں مستقل قیام کرلیا۔ اور اس کو دارالسلطنت قرار دے دیا۔ اس وقت سے فیض آباد کے بھی بہت سے اُمراء لکھنؤ آنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح سے مختلف خیالات اور فرقوں کے لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ شیعہ فرقہ کے علماء اور مجتہدین مذہبی فرائض کی انجام دہی کے لئے لکھنؤ میں موجود ہوں۔ چنانچہ ۱۳ رجب سنہ ۱۲۰۰ھ کو مولانا سید دلدار علی (غفران مآب) نے پہلی نماز جماعت شیعوں کو پڑھائی۔ یہ زمانہ نواب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی وزارت کا تھا۔ جنھوں نے مولانا کو ادھر متوجہ کیا کہ وہ اس ضرورت کو پورا کریں۔ اس سے قبل لکھنؤ میں کوئی شیعی عالم اس حیثیت کا نہ تھا۔ فتاوے اور دیگر شرعی امور میں مشورہ اہالیان سلطنت سنی علمائے فرنگی محل سے کرتے تھے۔ دوسرے شرعی امور کی انجام دہی کے لئے جن میں شیعی طبقہ سنی علماء سے کام نہیں لے سکتا تھا مثلاً نماز جنازہ وغیرہ اس وقت لکھنؤ میں غالبًا ایسے دو چار شیعی علماء موجود تھے جو ان خدمتوں کو انجام دیتے تھے۔ مولانا سید دلدار علی (غفران مآب) کا لکھنؤ میں ورود شیعی طبقہ کی رہبری اور مذہبی تنظیم کا سبب ہوا۔ ان کے مستقل قیام اور سلطنت کی ہمت افزائی اور سرپرستی نے لکھنؤ کو ہندوستان میں شیعیت کا مرکز بنا دیا۔

غفران مآب نے خود تو تعلیم شروع میں سنی علماء سے حاصل کی تھی اور اس کے بعد تکمیل علم ایران اور عراق کے علماء سے کی مگر لکھنؤ میں رہ کر انھوں نے شیعی مذہب

کی تعلیم کا ایک ایسا سلسلہ قائم کر دیا جس سے تکمیل بھی یہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سیکڑوں شیعی علما ہو گئے جن میں سے ہر ایک نے اپنا سلسلہ غفران مآب یا اُن کے خاندان کے کسی فرد یا اُن کے کسی شاگرد سے قائم کیا۔ مفتی میر عباس اور مفتی حیدر رکے سے ذی علم اور ذی اقتدار لوگ غفران مآب کے اسی ادارہ سے سیراب ہوئے۔

غفران مآب اور ان کے مشہور و معروف جانشین مولوی سید محمد المعروف بہ سلطان العلماء نے کثرت سے تصانیف بھی کیں جن میں اکثر اس زمانے کے سنی و شیعہ اختلاف سے متاثر تھیں تحفۂ اثنا عشریہ شاہ عبدالعزیز کا جواب اپنی متعدد تصانیف میں ان حضرات نے دیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شیعہ اور سنی اختلافات بہت بڑھ گئے تھے شیعیت کے اس نئے مرکز نے لکھنؤ میں شیعی خیالات کی ترجمانی اپنا نصب العین قرار دیا۔ باوجودیکہ خود لکھنؤ میں آبادی کے لحاظ سے شیعوں کی تعداد سنیوں سے بہت کم تھی۔ مگر چونکہ اہل دربار اور امراء میں شیعہ بہت زیادہ اور با اثر تھے۔ اس لئے باوجود بادشاہ اور اراکین سلطنت کے اصولی رواداری کے یہ شکایات عام تھیں کہ تبرا علی الاعلان ہوتا ہے۔ اور اہالیان سلطنت چشم پوشی کرتے ہیں۔ اکثر محرم کے زمانہ میں فسادات ہوتے تھے جن کی شکایتیں ریزیڈنٹ لکھ کر کلکتہ بھیجا کرتا تھا۔

اسی زمانہ میں ایک دوسرا عربی تعلیم کا ادارہ لکھنؤ میں قدیم سے موجود تھا۔ جس کی بے تعصبی ضرب المثل ہے۔ یہ فرنگی محل کے علماء کا گروہ ہے۔ جو باوجود سنی المذہب ہونے کے مذہبی اختلافات سے کنارہ کش تھا۔ اور اسی گروہ کے

اکثر بزرگ صوفی المشرب بھی تھے جس کی وجہ سے اور بھی ان کے مذہبی خیالات تشدد سے پاک تھے۔ یہ کہنا کہ شیعی سلطنت کی رعیت ہونا اور شیعہ مجتہدین اور علماء سے ربط وضبط، اس بے تعصبی کی وجہ نہ تھی۔ تاریخی حیثیت سے غلط ہوگا۔ مگر یہی کیا کم ہے کہ فرنگی محل کے علماء نے ایک ایسا صلح کل طریقہ اور خالص علمی مذاق قائم رکھا جس سے سیاسی اور مذہبی فضا مکدر نہ ہوئی۔ اگر فرنگی محل کے کسی شخص کو انفرادی حیثیت سے کبھی لکھنؤ کے مذہبی موشگافیوں اور شیعی اہل دول کی انفرادی استبدادیت سے تکلیف پہونچی تو اُس نے یا تو مطلق خانہ نشینی اختیار کی یا وطن کو خیرباد کہا اور اپنی باقی عمر کسی دوسرے مقام پر جا کر بسر کی۔

خالص صوفیہ کا ایک گروہ بھی سلطنت اودھ کی رعایا میں موجود تھا۔ جو اس اصول کا پابند تھا ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اس طبقہ کے لوگ جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا سلطنت اور امراء سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اور خمول اور گمنامی میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے خود لکھنؤ میں وقتاً فوقتاً ایسے صوفیا موجود رہے جیسے مولانا عبدالرحمٰن صوفی، ان کے علاوہ ایک مستقل ادارہ جو بلحاظ فقر و تصوف مرکزی حیثیت رکھتا تھا بیت السلطنت سے بہت قریب آٹھ میل قصبہ کاکوری میں موجود تھا۔ اس کے بانی شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی اور ان کے صاحبزادے شاہ تراب علیؒ قلندر عہد واجدی تک تو زندہ نہ تھے۔ مگر اس وقت بھی اس خانقاہ کے صاحب سجادہ کے اثرات صرف مقامی

نہ تھے بلکہ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ علاوہ تصوف کی علمی اور عملی واقفیت کے
اس ادارہ کے حضرات علوم دینیہ فقہ اور حدیث کے پورے عالم ہوتے تھے۔
چنانچہ حضرت شاہ تراب علیؒ موخر الذکر کے ایک صاحبزادے مولانا شاہ تقی علی قلندر
اپنے زمانہ کے متبحر علماء میں مانے جاتے تھے۔ اس ادارہ نے علی الخصوص علم تصوف
کی بہت بڑی خدمت کی۔ اور کثرت سے تصانیف فارسی اور اُردو میں کیں جنسے
تصوف کی نشر و اشاعت ہوئی۔

اسی طرح کے کم از کم دو ادارے اور موجود تھے۔ ایک صفی پور (اناؤ)
دوسرا سلون ضلع رائے بریلی میں جو اہل تصوف میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

اس زمانہ کے مذہبی رجحانات میں ان مسلمان حنفی المذہب علماء کا ذکر کرنا
ضروری ہے جن کو عام اصطلاح میں اہلِ حدیث اور بعض لوگ وہابی بھی کہتے
تھے۔ ضلع رائے بریلی کے قریب قصبۂ نصیر آباد میں انیسویں صدی کے شروع میں
ایک بزرگ ہوئے جن کا نام مولوی سید احمد تھا۔ انھوں نے سکھوں کے خلاف جہاد
کیا۔ اور شہادت حاصل کی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ اسلام کو نئے رواج اور بدعت سے
پاک کیا جائے، قرونِ اولیٰ کے طریقے اور اصول کو پھر رواج دیا جائے۔ مولوی
سید احمد اور ان کے ہم مشرب لوگوں نے ایک بہت بڑا گروہ قائم کر لیا تھا۔ جو اس
اصول کا حامی تھا۔ ان سے سنی اور شیعہ علماء سے مناظرے بھی ہوتے تھے۔ اور
جس طرح سے وہ اپنے اصول سے ذرا سا تفاوت ناجائز قرار دیتے تھے اسی طرح
دوسرے بھی ان کو تشدد کا الزام دیتے تھے۔ اور ان کے عمل کو قابل تقلید نہیں
جانتے تھے۔ ان کا مسلک مروج صوفیہ کے مسلک کے بالکل خلاف تھا۔ مزارات پر

روشنی، عرس، محافل سماع اور حال وقال کو یہ معیوب سمجھتے تھے پنجاب اور بنگال کے صوبے اس تحریک سے خاص طور پر متاثر ہوئے گو کہ دوسرے مقامات پر بھی اس کا اثر تھا۔ گویا کہ اس کی تنظیم مقامی نہ تھی بلکہ ملک کے اکثر حصوں میں پھیلی ہوئی تھی۔
اس نئی تحریک نے حکومت انگریزی سے مخالفت شروع کردی جس نے اسکے کارکنوں کو سخت سزائیں دیں اور تحریک کو مذہبی بغاوت سمجھ کر مٹانے کی کوشش کی۔

معاشرت

نوابی کا دور اپنی معاشرت اور رہن سہن کے لحاظ سے ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ ایک انگریز خاتون نے جس کا قیام عرصہ تک لکھنؤ میں رہا، لکھنؤ والوں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ نہایت متمدن اور مہذب ہیں۔ ان کی گفتگو نہایت شائستہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کے لوگوں کا مذاق نہایت شستہ اور ان کی گفتگو اور لہجہ اپنی خاص خصوصیات رکھتا ہے۔ اکثر جاہل عوام بھی وہاں ایسی زبان بولتے ہیں کہ دوسری جگہ کے مہذب اور تعلیم یافتہ اُس قدرتی اسلوب بیان کو سُن کر آفریں اور تحسیں پر مجبور ہو جاتے ہیں شاعری اور ادبی خوبیاں لکھنؤ کے لوگوں میں سرایت کر گئی ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ نوابی حکومت کے عیش وعشرت نازک خیالی اور نفاست مزاجی نے عوام کو بھی اس رنگ میں رنگ دیا تھا۔ مثلاً ہر شخص جو معمولی طور پر شد بد پڑھ لیتا تھا طبع آزمائی کرنے لگتا تھا۔ جہلا اور عوام ادنیٰ طبقہ کے لوگ، یہاں تک کہ گھر بیٹھنے والی عورتیں تک ادبی نزاکتیں اور شاعرانہ تخیل کو سمجھنے اور داد دینے کی عادی ہو گئی تھیں

جہلا کی زبان بھی اتنی شستہ تھی کہ دوسرے مقامات کے لوگ تعجب کرتے تھے اخلاق حفظ مراتب اور تمدنی آداب جو لکھنؤ کی معاشرت کے خصوصیات تھے ان کا اثر گفتگو میں بھی پورے طور پر پایا جاتا تھا۔ عورتوں کی زبان پردہ نشین ہونے کی وجہ سے مردوں کی زبان سے بہت کچھ مختلف تھی۔ علاوہ ازیں بیگماتی زبان میں ادبی اور شاعرانہ نزاکتیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ بقول شاعر ؂

زباں کے خلد کی ہے حور عورت   اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں سے
زباں کے ملک کا سکہ ہے عورت   انوکھا ہے چلن سارے جہاں سے
زباں کا فیصلہ ہے عورتوں پر   یہ باتیں مرد وے لائیں کہاں سے
زباں دانی ہے حصہ بیگموں کا   لڑا لے کیا زباں کوئی زباں سے

اس کے علاوہ پھبتیاں ضلع اور جگت کے فن میں لکھنؤ والے طاق تھے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے، باہر نکلنے والی عورتیں، جاہل دوکاندار، اور ادنیٰ طبقہ کے اہل حرفہ ایسی پھبتیاں کہہ جاتے تھے کہ دوسری جگہ کے لوگ متحیر ہوتے۔ قصہ مشہور ہے ایک صاحب کربلائے معلی کی زیارت کر کے واپس آئے۔ اور نہایت سفید کپڑے پہن کر دوستوں میں آکے بیٹھے ہی تھے کہ ایک چھوکرے نے پھبتی کسی "یہ فراش کا بنگلہ کہاں سے آگیا"۔ اسی طرح پر ایک مرتبہ کسی نواب صاحب کے یہاں شادی کے موقع پر کشمیری بھانڈ بلائے گئے اُن کو موافق معمول ایک دوشالہ انعام میں ملا۔ دوشالہ اتفاق سے بہت پرانا اور بوسیدہ تھا۔ ایک بھانڈ نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور بہت گہری نظریں جما دیں، دوسرے نے پوچھا کیا دیکھتے ہو؟ کہا۔ دیکھتا ہوں کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے، پوچھا آخر کیا لکھا ہے عینک نکال کر

لگائی اور اٹک اٹک بہت مشکلوں سے پڑھا۔ لا الہ الا اللہ، ساتھی نے پھر سوال کیا کہ بس محمد الرسول اللہ نہیں لکھا ہے۔ برجستہ جواب ملا۔ محمد الرسول اللہ کیسے لکھا ہو یہ تو ہمارے حضرت سے پہلے کا ہے۔

سبحان اللہ کتنا شستہ مذاق اور کیسا برجستہ فقرہ ہے۔ یہ چیزیں لکھنؤ ہی کا حصہ ہیں یگفنگو کے علاوہ نشست و برخاست اور آداب محفل بھی لکھنؤ والے خوب جانتے تھے مثلاً بزرگوں کے سامنے چھوٹے نہایت ادب سے اٹھتے بیٹھتے تھے۔ شاہی دربار کی پیروی میں سلام کا طریقہ بھی مختلف تھا۔ مثلاً بادشاہ اور امرا کے دربار میں کچھ تعداد مقرر تھی مثلاً سات سلام چھوٹے بڑوں سے اور غریب امیروں سے نہایت جھک کے تسلیم یا آداب عرض کرتے تھے۔ جسکے جواب میں بزرگ جیتے رہو، صاحب اقبال ہو کہتے تھے اور امرا غریبوں کے سلام کے جواب میں فقط ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔ برابر والوں میں صاحب سلامت اگر کسی محفل میں ہوتی تھی۔ تو طریقہ یہ تھا کہ اٹھ کھڑے ہوں اور جھک کر جواب میں سلام کے بعد مزاج شریف یا مزاج اقدس بھی ضرور کہیں۔

معاشرت کے آداب میں اس چیز کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ رنڈیوں اور زنان بازاری کا اثر سماجی زندگی پر بہت زیادہ تھا۔ نہ صرف امرا بلکہ عوام بھی اس کو داخل فیشن سمجھتے تھے کہ ان سے صحبت و ارتباط رکھیں۔ یہ مشہور ہے کہ امرا اپنے لڑکوں کو آداب محفل سکھانے کے لئے رنڈیوں کے یہاں بھیجتے تھے عیش و عشرت اور برسوں کی عیش پسندی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ آبرو فروش عورتیں مہذب سوسائٹی میں بے دھڑک شامل کی جاتی تھیں۔ شجاع الدولہ کے

وقت سے لکھنؤ میں زنانِ بازاری کی کثرت تھی۔ اور نصیر الدین حیدر کے ایسے وارفتہ مزاج عیش پرست نے اس کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔ ایک ہمعصر مؤرخ لکھتا ہے "سترہ سو جلسے والیاں نادرۂ زمانہ، شہرۂ آفاق، محبوبی میں طاق ملازم تھیں۔ بارہ سو چست و چالاک بیباک فنِ موسیقی میں یکتا، جانِ دلبری سراپا ان کے علاوہ ہزاروں رنڈیاں جوبن کی متوالیاں، ماہ سیما رشک پری کمسن جنکے امنگ کے دن، پری رو حاضر، ہر آن گویا جلسے کی جان .... پرکالۂ آفت اور حضرت کا تخت مثل تخت سلیماں کاندھوں پہ لئے جیسے ستاروں میں قمر کے جلوے ناچ گانے میں رات بسر ہوتی"

اس سے زیادہ واقعات Knughton کی کتاب The life of an Eastern King میں درج ہیں جن کا ترجمہ شباب لکھنؤ کے نام سے ہو چکا ہے۔

واجد علی شاہ نے بھی طوائفوں کی کثرت اور ان کے اثر کو کم نہیں کیا بلکہ ان کے ذوق اور موسیقی کے مذاق نے اس طریقہ کی اور بھی پرورش کی۔

تفریحات

یورپین سیاحوں نے لکھا ہے کہ اودھ کے رہنے والوں سے زیادہ تماشہ بیں خلقت کم ہوگی۔ مذہبی تیوہار اور بزرگوں اور سنتوں کے نام کے میلے اور عرس تماشہ اور تفریحات کے علاوہ مذہبی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اور ہندو مسلمان دونوں اُن مقدس تماشہ گاہوں میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں

جمع ہوتے تھے۔ خود لکھنؤ میں ہر نوچندی کو شاہ مینا صاحب کے مزار پر ہر طبقہ کے لوگوں کا مجمع ہوتا تھا اور قوالی اور ناچ رنگ کی محفلیں جن میں صاحب حال اپنے رقص کا مظاہرہ بھی کرتے تھے ، منعقد ہوتی تھیں۔ دوسری طرف ایک معبد حضرت عباس کی درگاہ میں بن گیا تھا۔ جہاں شیعی حکومت کی عقیدت مندی کی وجہ سے عوام اور خواص کا بڑا مجمع ہوتا تھا۔ اسی طرح سے ہندؤں کا کالی جی کے مندر میں ہر ہفتہ ایک میلہ لگتا تھا جس میں مرد عورت ہزاروں کی تعداد میں درشن کرنے آتے تھے۔ اس کے علاوہ خود شہر میں اور اس سے متصل بعض، مخصوص مقامات، جیسے جنات کی مسجد، بڑے مجمع کی جگہیں تھیں۔

محرم میں ہر سال لاکھوں روپیہ روشنی اور دوسرے لوازمات میں صرف ہوتا تھا۔ جو لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہوتے تھے۔ عزاداری محض مذہبی سوگ اور ماتم تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ محرم کے مجمع تماشائیوں کے لئے دل بہلانے کا ذریعہ بھی ہوتے تھے۔

شیعی سلطنت کی سرپرستی نے لکھنؤ کو نہایت متمدن مہذب اور با ادب ماتم کدہ بنادیا جس میں ادب اور موسیقی کے اختلاط سے نئے فن پیدا ہو گئے جنھوں نے لکھنؤ کے تمدنی فضا میں پرورش پاکر ملک کے اور حصوں میں بھی اپنے اثرات پیدا کئے مثلاً مرثیہ گوئی، نوحہ خوانی، حدیث خوانی، تحت اللفظ جس کے استاد اور جاننے والے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اور شاہی دربار اور امرا کی محفلوں میں بڑے ادب و احترام سے مدعو ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے ادبی مذاق نے اردو شاعری کو اس قدر بڑھادیا کہ

مشاعرے لکھنؤ کی زندگی کا جزو اعظم بن گئے تھے۔ آتش، ناسخ، انیس، دبیر، کی مستقل پارٹیاں تھیں جن میں برابر چوٹیں چلتی تھیں۔ ان مشاعروں اور ادبی صحبتوں نے لکھنؤ کو مشرقی تمدن کا نمونہ بنا دیا تھا جس کا مقابلہ اس وقت دلی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ان ادبی دلچسپیوں کے علاوہ لکھنؤ میں بہت سے اور تماشے اور بازیوں کے موقعے تھے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور پتنگ بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی، اور مرغ بازی تھی جن میں عوام و خواص دونوں شریک ہوتے تھے۔ کبوتر بازی کے عجیب عجیب واقعات مشہور ہیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں اس میں بھی عجیب عجیب اختراعیں ہوئی تھیں۔ ایک شخص نے ایک دوہرا کبوتر بنایا تھا۔ وہ اس طرح کہ دو کبوتر کے پٹھے لے کر ایک کا دایاں اور دوسرے کا بایاں بازو کاٹ دیا۔ اور کٹے ہوئے دونوں بازوں میں ٹانکے لگا کے دوہرا کبوتر بنا لیا۔ اور ایسی داشت سے پالا کہ وہ بڑے ہوئے اور اڑنے لگے۔ لکھنؤ کی پتنگ بازی کے شوق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آصف الدولہ کی تکل میں پانچ روپے کے مقیش کی جھلجھلی ہوتی تھی۔ جو لوٹ لاتا اسے پانچ روپئے دے کر لے لی جاتی تھی۔ بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں بکثرت تھا۔ بٹیروں کے بڑے شاندار نام رکھے جاتے تھے۔ جیسے رستم سہراب وغیرہ۔

مرغ کو لڑانا بھی لکھنؤ کا خاص ذوق تھا۔ نواب سعادت علی خاں ایسا بیدار مغز بھی مرغ بازی کا دلدادہ تھا۔ یہ شوق واجد علی شاہ کے زمانہ تک۔

زور وہاں پر رہا۔

فنون

موسیقی کے فن نے بھی لکھنؤ میں بڑی ترقی کی نواب شجاع الدولہ کی قدردانی اور فیاضی نے تمام ہندوستان کے موسیقی کے استادوں کو اودھ میں اکٹھا کر دیا آصف الدولہ کے زمانے میں اس فن پر ایک کتاب لکھی گئی جس کا نام اصول النغمات الآصفیہ ہے۔ یہ ہندوستانی فن موسیقی پر بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں ایک بہت بڑا کامل فن حیدری خاں یہاں موجود تھا جو بالکل وارفتہ مزاج تھا یہ قصہ مشہور ہے کہ بادشاہ کو اس کا گانا سننے کا بہت اشتیاق تھا۔ اتفاق سے ایک روز بادشاہ سواری پر جا رہے تھے اور وہ دکھائی پڑا لوگوں نے عرض کی کہ حیدری خاں جا رہا ہے بادشاہ نے فوراً سواری رکوائی اور حیدری خاں کو بلوایا لوگ انکو پکڑ لائے جب وہ قریب پہونچا تو بادشاہ نے کہا کہ ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے بولا حضور کیوں نہ سناؤں گا، مجھ کو آپ کا گھر نہیں معلوم ہے اس پر بادشاہ نے کہا کہ آؤ بیٹھو ہم اپنے گھر پر تم کو لے چلیں گے۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ حیدری خاں ہتھے پر سے اکھڑ گئے اور کہنے لگے میں چلتا تو ہوں مگر پوریاں بالائی کھلا دیجے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حیدری خاں نے شاہی محل میں بیٹھ کر پوریاں بالائی کھائی اور بادشاہ کو اپنے فن کا کمال دکھایا۔

واجد علی شاہ کے عہد میں اس فن کے کاملین کا بڑا گروہ لکھنؤ میں جمع ہو گیا تھا مثلاً قطب الدولہ ستار خوب بجاتے تھے۔ انیس الدولہ مصاحب الدولہ اور

رضی الدولہ مشہور گوئیے تھے۔ چونکہ بادشاہ خود قدردان تھے اس لئے اس زمانہ میں اس فن نے لکھنؤ میں ایک خاص قسم کی ترقی کی، اور وہ یہ تھی کہ موسیقی کو عام پسند بنانے اور سدھارنے میں لکھنؤ نے بڑا زبردست حصہ لیا۔

ناچ کے فن نے بھی لکھنؤ میں بڑی ترقی کی یہاں کی رنڈیاں ہندوستان بھر میں اس فن میں مشہور تھیں۔ ان کے علاوہ مرد ناچنے والوں کا ایک الگ گروہ بھی پیدا ہو گیا جو کشمیری بھانڈ کہلانے لگے۔

یہ نقل کرنے کے فن میں اُستاد تھے ان کے لطیفے نوک جھونک کے فقرے اور نقالی کے کمالات لکھنؤ میں مشہور ہیں۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ نواب علی نقی خاں یعنی واجد علی شاہ کے سسر اور وزیر ایک مرتبہ مع بیگم صاحبہ قائم نامی بھانڈ کی سبیل کو دیکھنے آئے جسے وہ محرم کے موقع پر خوب سجاتا تھا معزز زائرین کو دیکھتے ہی قائم ہاتھ جوڑ کر حاضر ہوا اور عرض کی کہ خدا نواب صاحب کو سلامت اور بیگم صاحبہ کو قایم رکھے۔ نواب صاحب نے باوجود اس گستاخی کے اسکی ظرافت پر اس کو انعام دیا۔

علاوہ ان فنون لطیفہ کے سپاہیانہ فنون بھی رائج تھے مثلاً کشتی بانک پٹہ وغیرہ۔ اودھ کے رہنے والے فن سپہگری میں بہت مشہور تھے اور ان کی بہت بڑی تعداد انگریزی فوج میں ملازم تھی۔

مٹی کے کھلونے بنانا۔ کپڑے پر جالی کاڑھنا، چکن کا کام، زردوزی ہاتھی دانت کے خوبصورت چھوٹی چیزیں بنانا ان تمام چیزوں میں لکھنؤ بہت مشہور تھا۔

تجارت

اودھ کا ملک تین طرف سے انگریزی سلطنت اور چوتھی سمت نیپال
کے راج سے گھرا ہوا تھا۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا۔ کہ اس کی تجارت ان ہی
دونوں ملکوں سے ہو سکتی تھی۔ انگریزوں سے تجارتی معاہدے عجیب قسم کے تھے
جن کا ماحصل یہ تھا کہ اودھ کی صرف وہ پیداوار باہر جاتی تھی جس سے کمپنی
اور ملک کو نفع پہونچتا۔ چونکہ انگریزی ملک تین طرف سے اودھ کو گھیرے ہوئے
تھا۔ اور برآمد کا راستہ کوئی اور نہ تھا اس لئے انگریزوں نے [illegible]
[illegible] یا چنگی سخت لگا رکھی تھی۔ تاکہ اودھ کی اشیا برآمد کمپنی کے ملک
کی پیداوار سے مقابلہ نہ کر سکے اور صرف وہی تجارتی اشیا کمپنی کے ملک میں
آسکیں یا اس کے ذریعہ باہر جاسکیں جن سے انگریزی ملک اور کمپنی کو فائدہ ہو
یہ چیز اس طور پر تھی کہ تجارتی معاہدہ میں کمپنی اور اودھ کے نواب دونوں کو
اس کا حق تھا کہ اپنے ملک میں آنے والے سامان پر سوائے چند مخصوص چیزوں
کے جو محصول چاہیں لیں چونکہ اودھ کی پیداوار کے لئے ذریعہ برآمد کمپنی ہی کا
ملک تھا اس لئے اس کو اس معاہدہ سے سخت نقصان پہونچا۔ اور رفتہ رفتہ
اودھ کی اشیا، برآمد درآمد سے بہت کم ہو گئیں۔ یہ اصول ہے کہ جب کسی ملک
کی درآمد بڑھ جاتی ہے تو اس کو تجارتی نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ
اس کا سونا اور اس کی دولت اشیا، درآمد کے صلہ میں ملک سے باہر چلی جاتی
ہے۔ یہی صورت اودھ کے ساتھ بھی ہوئی ۲۸ جنوری سنہ ۱۷۹۴ء کے ایک خط میں

جو کسی انگریز کا سرجان شور کے نام ہے اس کی شکایت کی گئی کہ شکر اور نیل پہ
اودھ کے ملک میں بکثرت پیدا ہوتی ہے اور وہاں کی ضرورت سے زیادہ
ہونے کی وجہ سے باہر بھیجی جاتی ہے کمپنی کی حکومت نے ایسے سخت اور
بھاری محاصل لگا رکھے ہیں کہ ان کا ملک سے باہر جانا ناممکن ہے۔ اور یہ
شکایت کرتے ہوئے یہ اپیل کی گئی ہے کہ تجارتی آزادی قائم رکھنے کے لئے
انگریزی قوم کو یہ چاہئے کہ وہ کمپنی کو اس جبر و تشدد سے باز رکھے۔

خوش حالی

باوجود ان تجارتی دقتوں کے اودھ پھر بھی کمپنی کے مقابلے میں آباد
اور خوش حال معلوم ہوتا تھا۔ Shore نے اپنی کتاب Notes
on Indian affairs میں اس کی شہادت دی ہے اور یہاں کے
بازاروں کا سامان سے بھرا پڑا ہونا بھی دکھایا ہے۔ اس نے مثال کے طور پر
اس واقعہ کو لکھا ہے کہ لکھنؤ کے بازار میں ایک شخص کو اپنی ضرورت کے مطابق
جیسی اور جتنی مخمل کی ضرورت تھی مل گئی۔ باوجودیکہ اس نے کلکتہ سے لے کر
کانپور تک ہر جگہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ علاوہ اس کے اودھ
کے باشندے اپنا پیسہ باہر کی تجارت میں لگاتے تھے۔ جو کہ اس کا ثبوت ہے کہ
لوگوں کے پاس اتنی دولت تھی کہ اپنا اندوختہ باہر کی تجارت میں لگاتے
اور فائدہ حاصل کرتے۔

غربا بھی کچھ زیادہ پریشان حال نہ تھے۔ اس لئے کہ امرائے شعار میں

یہ چیز داخل تھی کہ وہ فیاضی سے داد دہش کریں جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں کی پرورش ہوتی تھی۔ ہر امیر کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ اور یہ لوگ اکثر جاڑوں میں اپنے نوکر چاکر اور متوسلین کو جڑاولیں بانٹتے تھے۔ محتاج اور غریبوں کو خیرات اور صدقہ دینا مذہبی فرض سے بھی بڑھ گیا تھا اور شانِ امارت میں یہ چیز داخل تھی کہ امرا اور رؤسا کی سواریوں کے نکلنے کے وقت محتاج مجمع کرتے تھے اور ان کو نچھاور کے طور پر خیرات بٹتی تھی جس میں حیثیت کے مطابق پیسے، روپیئے اور اشرفیاں تک ہوتی تھی۔ محرم کے دس دن اسقدر خیرات ہوتی تھی کہ غریبوں کے گھروں پر کھانا نہیں پکتا تھا۔ بلکہ روٹی کے ٹکڑے اور پلاؤ کے چاول سکھا کے رکھ دئیے جاتے اور بعد کو استعمال ہوتے اس کے علاوہ غریبوں کی لڑکیوں کی شادی کا خرچ برداشت کرنا اور جہیز دینا بڑا ثواب سمجھا جاتا تھا۔ کنویں کھدوانا، پل بنوانا، اور سرائے یا دھرم شالوں کی مرمت کرانا امرا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ اس طرح بہت سی دولت امرا کی خود بخود غریبوں کے کام آتی تھی۔ اور غربا کی مفلسی رفع ہوتی تھی۔

